کانچ کا شہر

کانچ کا شہر ہے پتھر نہ اُٹھاؤ یارو
میکدہ ہے اِسے مقتل نہ بناؤ یارو

فیض الحسن خیال

تاریخ وسنہ اشاعت	یکم ڈسمبر ۱۹۷۹ء
بارِ اوّل	ایک ہزار
کتابت	محمد عارف الدین خوشنویس
قیمت	۱۲ روپے
طباعت	اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد
ناشر	ادارۂ شعر و حکمت، لکڑی کا پل۔ حیدرآباد
ٹائٹل طباعت	انتخاب پریس، جواہر لال نہرو روڈ

رقمی معاونت
- اردو اکیڈیمی، آندھرا پردیش
- نظامس اردو ٹرسٹ، حیدرآباد
- محکمۂ تعلیمات، حکومت آندھرا پردیش

ملنے کے پتے :

اردو اکیڈیمی، اے، سی، گارڈ، شانتی نگر، حیدرآباد، آندھرا پردیش

الیاس ٹریڈرس، شاہ علی بنڈہ، حیدرآباد

مصنّف : ۲۰ ، ۴ ، ۲۳۰ موتی گلی، حیدرآباد

پیش لفظ

فیض الحسن خیالؔ جدید دور کے شعرائے حیدر آباد میں نمایاں مقام رکھتے ہیں خیالؔ کو غزل کی صنف سے زیادہ لگاؤ ہے اور وہ اس کے ادا شناس بھی ہیں۔ انھوں نے غزل کی مانوس زبان کو مخصوص انداز میں برتتے ہوئے ایک ایسا اسلوب تشکیل دیا ہے، جس میں دلکشی بھی ہے اور انفرادیت بھی۔ ان کے لہجے میں نہ تو جارحانہ انانیت ہے اور نہ ہی غیر مشروط خود سپاری کا عجز۔ اس کے برخلاف اس میں زندگی کی محرومیوں اور شکستوں سے پیدا ہونے والے گداز کے ساتھ خود داری کا احساس شامل ہے۔ چنانچہ وہ جذبات کے اظہار میں ہمیشہ اعتدال اور توازن کو برقرار رکھتے ہیں۔ میرؔ کی طرح وہ بھی ناکامیوں سے کام لے کر زندگی کرنے اور محبت میں اپنے سلیقے سے نبھانے کا ہنر جانتے ہیں۔

فیض الحسن خیالؔ نے غزل کی صنف کو اس کے وسیع تر امکانات کے ساتھ برتنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ ان کی غزل کا واحد متکلم ایک ایسا عاشق ہے جس کا غم اس کی ذاتی محرومیوں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے دائرے میں ساری زندگی کا کرب اور نوعِ انسانی کے دکھ درد کا احساس سمٹ آیا ہے۔ وہ اپنی کہانی کو رودادِ جہاں بنا کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ جو بھی سنتا ہے اسے اپنی ہی داستاں معلوم ہوتی ہے۔

فیض الحسن خیالؔ نے جن احساسات کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ وہ ان کے سماجی اور سیاسی شعور کی ترجمانی کرنے کے ساتھ کہیں کہیں موجودہ عہد کے انسان کی وجودی صورتِ حال کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے غزل کی شاعری کے روایتی استعاروں کو نیا مفہوم دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ پیش رو ترقی پسند شاعروں کی طرح فیض الحسن خیالؔ نے استعاروں کو سادہ اصطلاحوں میں تبدیل نہیں کیا بلکہ ان کے روایتی تلازموں کو برقرار رکھتے ہوئے نئی معنوی جہت کا اضافہ کیا ہے انھوں نے شاعری کو سیاسی اور سماجی خیالات کی براہ راست تبلیغ کا ذریعہ بنانے کے بجائے سیاسی استبداد اور معاشی استحصال کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار گہری اور دُور رس ایمائیت کے ساتھ کیا ہے جس کی وجہ سے شعر کی تاثیر دوبالا ہو گئی ہے۔

کسی شاعر کی تمام تخلیقات ایک ہی معیار کی نہیں ہوتیں اور فیض الحسن خیالؔ کا کلام بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ لیکن جب کسی شاعر کے مقام اور مرتبہ کا تعین کرنا ہو تو اس کی بہترین تخلیقات ہی کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

فیض الحسن خیالؔ کے منتخب کلام کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے اسلوب اور فن کی جن خصوصیات کی نشان دہی کی گئی ہے، ان کی ایک جھلک ذیل کے اشعار میں دیکھی جاسکتی ہے۔

لا کے منزل کے قریں لوٹی متاعِ عقل و ہوش
اک مسافر کو کہاں بے ساز و ساماں کر دیا

لے کے قندیلِ کرم کوئی بھی آگے نہ بڑھا
یہ وہ منزل ہے جہاں صاحبِ غم رہتے ہیں

کیا خبر تجھ کو ترے واسطے اے شمعِ حیات
کتنے پروانے ترے نام سے جل جاتے ہیں

لگا کے آگ جو خوش ہیں مرے نشیمن میں
انھیں خبر نہیں پھیلے گی آگ گلشن میں

فائدہ کیا ہوا شعلوں کو بجھانے سے خیال
تذکرہ اپنا چمن میں کسی عنواں نہ ہوا

گونگے سناٹوں کا آسیب لپٹ جائے گا
آپ ویران مکانوں میں نہ جھانکا کیجے

زندگی تجھ سے ملاقات کہاں ہوتی ہے!
ہم نے لیکن تجھے تنہائی میں اکثر دیکھا

پھول دامن میں سمیٹے ہوئے بیٹھے ہیں سبھی
پسِ گلشن ہیں جو حالات سناؤں کیسے

کبھی جو میں نے کیا تذکرہ نشیمن کا
چمن میں دینی پڑی قیمتِ بہار مجھے

ڈاکٹر مغنی تبسم
ریڈر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ

خیالؔ

فیض الحسن خیالؔ نہ میرے لئے نئے ہیں اور نہ آپ کے لئے اجنبی، آپ نے بھی بہت سے مشاعروں میں انھیں سُنا ہوگا۔ داد بھی دی ہوگی، کبھی آپ کی "بیداد" کا ہدف بھی بنے ہوں گے، محفلِ شعر میں جو بھی اپنے آپ کو روشناس کراتا ہے اس کی جھولی میں پھول بھی ہوتے ہیں اور پتھر بھی۔ شاعری ہی پر کیا موقوف ہے، دیگر اصنافِ سخن کی بھی یہی عالم ہے کہ آپ کے قلم سے جو بھی نکلا یا تو قدر شناسوں کی میراث بن گیا یا پھر نقّادوں کے بے رحم نشتر کی نوک سے کریدا گیا۔ یہ داستان تو بہت پُرانی ہے خیالؔ سے میری واقفیت اور شناسائی کی ڈور کا سرا کہاں سے شروع ہوتا ہے یہ مجھے یاد نہیں آتا۔ اور پھر جو لوگ بقول نیازؔ، ہر روز نظر کے سامنے آتے ہیں نظر ان پر ٹکتی نہیں۔ بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ حیدرآباد میں جتنے اچھے برے مشاعرے ہوتے ہیں ان میں فیض الحسن خیالؔ، صلاح الدین نیرؔ، اور رئیس اخترؔ کا اتحادِ ثلاثہ آپ کو بڑی سرگرمی دکھاتا نظر آئے گا۔ اگر میں بہ پاسِ محبت خیالؔ کو اردو کا بلند پایہ شاعر کہہ دوں یہ بات خود اس کی فکر اور اس کے تخیل کی نشو و نما میں حائل ہوگی۔ غزل بلاشبہ اردو شاعری کی بڑی مشکل صنف ہے، اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ اس مشکل صنف میں وارداتِ قلب رقم کرنے والے ہی اپنی باتیں سننے والوں کے ہونٹوں پر چھوڑ جاتے ہیں۔

خیالؔ کی شاعری عصرِ جدید کے اس انسان کے جذبات و حسیات کی ترجمانی کرتی ہے جو مشینوں کی گڑگڑاہٹ، فائلوں کے انبار اور ناآسودہ تمنّاؤں کے پہاڑ تلے دب کر اپنی انفرادی آواز کی کھوج میں ہے۔ شاید یہ مجموعہ اردو ادب میں کوئی گراں قدر اضافہ نہ ہو، لیکن اس کے صفحات میں ہمارے دلوں کی دھڑکن جذب ہے۔

خیالؔ نظم بھی کہتا ہے مگر اپنی فکری ساخت کے لحاظ سے غزل اس کے لئے موزوں ہے۔ وہ غالباً نئے علائم و تمثیلات کی تلاش بھی کر رہا ہے۔ اور اس کی جھلک آپ کو اس مجموعہ کو پڑھنے کے دوران کئی جگہ ملے گی۔

میری خواہش ہے کہ اس مجموعۂ کلام کا ہمدردانہ نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے اور ان تضادات ذہنی کو پیشِ نظر رکھا جائے تو آج کے شاعر کی تخلیق شعر میں ایک گرہ سی بن جاتے ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ خیالؔ کی یہ کاوش اپنے پڑھنے والوں کی پسندیدگی حاصل کر سکے گی۔

عابد علی خان

مدیر "سیاست" و معتمد اردو ادبی ٹرسٹ حیدر آباد

اپنی بات

شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کی خدمت میں اپنا تیسرا مجموعۂ کلام "کانچ کا شہر" اس توقع کے ساتھ پیش کر رہا ہوں کہ پہلے مجموعوں کی طرح اس مجموعہ کی بھی پذیرائی ہوگی۔

"موج صبا" میرا پہلا شعری مجموعہ ہے جو سنہ ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا جس کے مبصرین میں صفِ اول کے ممتاز ترقی پسند ادیب خواجہ احمد عباس اور معتبر اور متوازن ترقی پسند ادیب و نقّاد ڈاکٹر زینت ساجدہ ریڈر اردو جامعہ عثمانیہ شامل ہیں جنھوں نے میری شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے میری شاعری پر خوش آئند خیالات کا اظہار فرمایا۔

"صبح کا سورج" میرا دوسرا مجموعۂ کلام ہے۔ جو سنہ ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔ نامور نقّاد و ماہر لسانیات ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ لسانیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اس کتاب کے لئے کچھ اس انداز سے پیش لفظ لکھا کہ جس سے میری شاعری کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔

"کانچ کا شہر" کے لئے دورِ جدید کے صاحب بصیرت ممتاز شاعر و ادیب ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر اردو جامعہ عثمانیہ نے پیش لفظ لکھا ہے۔ جس میں ڈاکٹر صاحب نے میرے فن کے بہت سے پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔

اس شعری مجموعہ میں، مَیں نے صرف غزلیں ہی پیش کی ہیں۔ ان غزلوں میں آپ اپنے آپ کو، مجھ کو، سماج اور معاشرے کی نت نئی الجھنوں کو بھی پائیں گے۔ آپ یہ بھی محسوس کریں گے کہ تخلیق کار کِن کِن حالات سے ٹکراتے ہیں، آپ کے اور ہمارے دوست تجربوں کے بازار میں ہماری کیا قیمت لگاتے ہیں۔ یہ سب کچھ آپ اس کتاب میں پائیں گے۔

غزل صنفِ شاعری کی ایک معتبر اور مقبول صنف ہے میرا مزاجِ شاعری غزل



زمانہ کہتا ہے فیض الحسن خیال جسے
وہ اجنبی کی طرح اپنے گھر میں رہتا ہے

کی مناسبت سے مطابقت رکھتا ہے۔ میں مشاعروں میں اکثر غزل ہی سنایا کرتا ہوں۔ جدید، قدیم اور ترقی پسند ادب کی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا، لیکن میری دانست میں ہر دور کے ادب کی قدر کرنی چاہیئے۔ لیکن تخلیق کار کو یہ ادراک بھی ہونا چاہیئے کہ دورِ حاضر ہم سے کس بات کا متقاضی ہے۔ دورِ حاضر میں ہم کو کیا کرنا چاہیئے اور ہمیں دورِ حاضر سے کس لہجے میں گفتگو کرنی چاہیئے اور اس کو کس طرح ہم آواز بنانا چاہیئے۔ ان تمام باتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے غزل کہنا اور سنانا دونوں بہت ہی اہم باتیں ہیں۔

مشاعروں میں غزل سنانے یا کسی رسالے میں چھپنے سے پہلے شاعر کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ پہلے اپنی شاعرانہ صلاحیت کا جائزہ لے اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کی تخلیق عصرِ حاضر کے سامعین اور قارئین کے خیالات سے کس حد تک ہم آہنگ ہے۔ بہرحال! شاعر کی تخلیق وقت اور حالات کی غماز ہونا چاہیئے۔

بتاؤ کونسے منصور کی تلاش میں ہو
ہر ایک شخص صلیبوں کے درمیاں ہے یہاں

اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش، نظامس اردو ٹرسٹ اور حکومت آندھرا پردیش (محکمۂ تعلیمات) نے رقمی تعاون کیا ہے جس کے لئے میں شکر گذار ہوں۔

ممتاز شاعر و نقّاد ڈاکٹر مغنی تبسّم نے جن خیالات سے کتاب کے اولین صفحات کی زینت بڑھ گئی ہے میں اس حسنِ نظر کے لئے صاحبِ موصوف کا ممنون ہوں۔ جناب صلاح الدین نیّر اور جناب رئیس اختر میرے قریب ترین دوست ہیں جن کے تعاون کا شکریہ ادا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اردو زبان، اردو شعر و ادب اور اردو تہذیب کے سچے اور بے لوث خدمت گذار جناب عابد علی خان، مدیر روزنامہ سیاست نے میری شاعری کے بارے میں جن حوصلہ افزا خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ میرے لئے مشعلِ راہ رہیں گے۔ میرے شعری سفر میں ادارۂ سیاست، شخصی طور پر جناب عابد علی خاں اور جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر سیاست کی عنایتیں ہمیشہ معاون رہیں۔ مجھے توقع ہے کہ "کانچ کا شہر" آپ کی توجہ کا مرکز بنے گا۔

فیض الحسن خیال
۵ ر ڈسمبر ۱۹۷۹ء

انتساب

جواں سال ، صاحب بصیرت ، ہونہار صحافی
جناب زاہد علی خاں مینجنگ ایڈیٹر ،
روزنامہ "سیاست" کے نام
جو اُردو زبان اور اُردو تہذیب کی روشن علامت
ثابت ہوں گے

فیض الحسن خیال

تمہارے آنے کی رہتی ہے آرزو دل میں
تمہارے جانے کا منتظر ہیں رہتا ہے

بند مٹھی کا بھرم کھل کے نہ رہ جائے کہیں
گھر میں آئے ہوئے مہمان سے ڈر لگتا ہے



حمد

گُل بھی تُو بُوئے گُل بھی تُو اور گُلستاں بھی تُو
جَبّار تُو عدیل بھی تُو مہرباں بھی تُو
موجودِ ہر مکاں بھی تُو اور لامکاں بھی تُو
القصّہ مختصر کہ یہاں بھی وہاں بھی تُو

تیرا کرم ہے تیری عنایت جہان پر
غالب ترا یقین ہے ہر اک گمان پر
اک تیری ذاتِ حاکمِ مُطلق ہے بالیقیں
ساتوں طبق زمین ، ہیں سات آسمان پر

کہسار و دشت و صحرا و گلزار و کہکشاں
ہر ذرّہ تیری ذات کا آئینہ دار ہے
جن و ملک سے اُونچا ہے انسان کا مقام
کیا شان تیری اے مرے پروردگار ہے

ہر مشکلِ حیات سے دامن بچا رہے
گذرے فراغتوں سے بہر حال زندگی
اک لمحہ تیری یاد سے غافل رہے نہ دل
ہر سانس ! اللہ کہے تیرے خیال کی

نعت

وہ جس پر آپ کی نظرِ کرم اک بار ہو جائے
قسم اللہ کی جنّت کا وہ حقدار ہو جائے

ہماری زندگی کا بس یہی معیار ہو جائے
محمّد مصطفےٰ صلّی علیٰ سے پیار ہو جائے

کرم اللہ کا، سرکار کی نظرِ عنایت ہے
وگرنہ سانس بھی لینا یہاں دشوار ہو جائے

خیالِ سرورِ کونین سے اِتنی گذارش ہے
تصوّر ہی میں بس سرکار کا دیدار ہو جائے

بفضلِ حق وہاں سرکار کا بس نام کافی ہے
ہر اک تدبیر انساں کی جہاں بیکار ہو جائے

مداوائے غمِ دارین ہے اک جنبشِ ابرو
اِدھر بھی اک نظر یا سیّدِ ابرار ہو جائے

نبیؐ کی یاد جس انساں کے دل کا مقدّر ہو
وہ انساں بالیقیں تخلیق کا شہکار ہو جائے

شفاعت کا وسیلہ اور مداوائے غمِ عصیاں
یہ میری نعت یا شاہِ اُمم شہکار ہو جائے

خیالِ احمدِ مرسل ہو نصب العین ہر دل کا
یہ نعمت کاش ! ہم سب کے گلے کا ہار ہو جائے



بزمِ یاراں میں وہ کچھ سوچ کے آیا ہو گا
ایسے دیوانے کو ٹھوکر نہ لگاؤ یارو

رات ڈھل جائیگی میخانہ سنبھل جائیگا
کوئی نغمہ کوئی پیغام سناؤ یارو

زندگی رینگتی پھرتی ہے یہاں کاسہ بکف
اس کو اب وقت کا آئینہ دکھاؤ یارو

اب دھندلکوں میں بھی ہے تازہ اجالوں کا خیال
شب کی دیوار سلیقہ سے گراؤ یارو





کانچ کے شہر میں پتھر نہ اٹھاؤ یارو
میکدہ ہے اِسے مقتل نہ بناؤ یارو

صحنِ مقتل میں بھی میخانہ سجاؤ یارو
شب کے سناٹے میں ہنگامہ مچاؤ یارو

زندگی بکنے چلی آئی ہے بازاروں میں
اِس جنازے کے بھی کچھ دام لگاؤ یارو

جن کی شہ رگ کا لہو پھول کی انگڑائی تھا
اُن کو اب حالِ گلستاں نہ سناؤ یارو

پھیلتے سایۂ شب میں نہ چلو رک رک کے
بجھتی راہوں کو کفِ پا سے سجاؤ یارو



مرے خلوص کا ہر لمحہ امتحاں ہے یہاں
سوائے آپ کے ہر شخص بدگماں ہے یہاں

بتاؤ کونسے منصور کی تلاش میں ہو
ہر ایک شخص صلیبوں کے درمیاں ہے یہاں

جو پھول میں نے چنا تھا ہزار پھولوں میں
وہ پھول اصل میں پتھر کی داستاں ہے یہاں

نویدِ صبح کی تاریخ کیسے لکھیں ہم
ابھی تو آنکھوں میں بارود کا دھواں ہے یہاں

دلوں میں شعلے اُگانے کا فن تو آساں ہے
مگر گلاب اُگانے کا فن کہاں ہے یہاں

اُسی سے ہاتھ ملاتے ہیں قاتلانِ سحر
جو زندگی کے اُجالوں کا پاسباں ہے یہاں

اُگے تو کیسے اُگے روشنی کی فصل خیال
ابھی اندھیرا اُجالوں کے درمیاں ہے یہاں



قاتلوں کی صف میں ہیں کچھ صاحبِ کردار لوگ
کھل کے اپنے بازوؤں پر کر رہے ہیں وار لوگ

آئینوں کے شہر میں جب ہے لکیروں کا رواج
چہرے پڑھ کر ہم سے کیوں کرتے ہیں استفسار لوگ

وقت حالاں کہ برابر دے رہا ہے آگہی
کیوں چلے کشکول لے کر پھر سمندر پار لوگ

لمحہ لمحہ نت نئی سرگرمیاں ہیں وقت کی
شہر کی ہر موڑ پر ہیں برسرِ پیکار لوگ

آئینہ بننے میں، سو سو بار ٹوٹا ہوں یہاں
کیوں مجھے پڑھتے نہیں اب آئینہ بردار لوگ

آنسوؤں کو پینے والے آگ بھی برسائیں گے
وقت کی جب دھوپ بن جائیں سایہ دار لوگ

تذکرہ ہوتا ہے جب گلشن میں میرے قتل کا
مصلحت آمیز بن جاتے ہیں ذمّہ دار لوگ

روشنی ہی روشنی میخانہ سے مقتل تلک
کیا دیوانے کو اُٹھا لائے سرِ بازار لوگ

جب چلن میری وفا کا آئینہ بن جائے گا
اپنے ہی چہرے سے گھبرا جائیں گے عیّار لوگ

دیکھئے مزدور کی پیشانی پہ سُورج اُگا
اب دھندلکوں کو مٹا دیں گے کرن بردار لوگ

روشنیوں کے زمانے میں اندھیروں کا خیال
کیا اُجالے بیچنے والے ہیں پھر اک بار لوگ





ورق ورق جو کتابِ سحر میں رہتا ہے
وہ آئینہ کی طرح ہر نظر میں رہتا ہے

تمہارے آنے کی رہتی ہے آرزو دل میں
تمہارے جانے کا منظر نظر میں رہتا ہے

نہ جانے قتل کیا ہوگا کتنے لمحوں کا
وہ ایک شخص جو قاتل کے گھر میں رہتا ہے

سرورِ لطفِ عبادت، سکونِ قلب و نظر
ترے دیار ترے سنگِ در میں رہتا ہے

اسی لئے ہی تو میں بے نیازِ منزل ہوں
کسی کا نقشِ کفِ پا سفر میں رہتا ہے

وہ جس نے عمر گذاری اندھیری راتوں میں
وہ انتظارِ طلوعِ سحر میں رہتا ہے

یہ سوچ میں ہوں کہ سیرِ چمن سے کیا لینا
گلاب جیسا وہ چہرہ نظر میں رہتا ہے

تمام رات جو رہتا ہے اجنبی کی طرح
سحر ہوئی تو مری چشمِ تر میں رہتا ہے

بہت تلاش کیا آج تک بھی مل نہ سکا
وہ آدمی جو تمہاری نظر میں رہتا ہے

زمانہ کہتا ہے فیض الحسن خیالؔ جسے
وہ اجنبی کی طرح اپنے گھر میں رہتا ہے



یہ مشورہ ہے ہمارا نئی سحر کے لئے
کرن کرن کی ہو تقسیم ہر نظر کے لئے

سلیقہ چاہیئے پھولوں میں رہنے بسنے کا
کہ خار زخم نہ بن جائیں عمر بھر کے لئے

خوشی کے لمحے تو خوابوں کی طرح بیت گئے
صدی کا کرب ملا عمرِ مختصر کے لئے

ہمارے گھر میں تو مٹی کا اک دِیا بھی نہیں
تمام آئینے ہیں تیرے بام و در کے لئے

تری گلی سے گذرنا بھی اک عبادت ہے
مگر یہ فاصلہ صدیوں کا ہے بشر کے لئے

قدم قدم پہ بہاروں کا تذکرہ ہے مگر
اُجالے راس نہ آئے ہمارے گھر کے لئے

مسرتوں نے بھری بزم سے اُٹھایا ہے
تمہارے غم کی نوازش ہے عمر بھر کے لئے

کسے خبر ہے کہ اس فصلِ گُل میں کیا ہو گا
شجر برہنہ ہوئے چشمِ معتبر کے لئے

چمن پرستی مری خار تک چلی آئی
لہو میں اپنے نہانا ہے شاخِ تر کے لئے

بہ جبرِ عشق زباں میری کھُل سکی نہ خیال
خموشیوں کا سمندر ہے چشمِ تر کے لئے





یہ کس نے شاخِ گُلِ تر بھی توڑ ڈالی ہے
بھری بہار میں گلشن کا ہاتھ خالی ہے

یہ جانتا ہوں کہ پتھر کہاں سے آتے ہیں
تجھے خبر نہیں تیرا بھی گھر سفالی ہے

بہار آتے ہی محسوس ایسا ہوتا ہے
ہمارے پاؤں میں زنجیر پڑنے والی ہے

جو بات دفن تھی صدیوں سے شب کے سینہ میں
وہ بات لمحوں کی تقدیر بننے والی ہے

وہ جس کے گھر میں ہی سورج اُترنے والا تھا
اسی نے سلسلۂ شب کی رہ نکالی ہے

تمام راستے رنگیں، درخت سُوکھے ہیں
تمہارے شہر میں ہولی ہے یا دیوالی ہے

میں سوچتا ہوں خیالؔ آج کس سے بات کروں
ہر ایک شخص کا چہرہ یہاں سوالی ہے



زخم کتنے ہیں مرے دل میں نہ پُوچھا کیجیے
آپ میلوں میں مجھے لا کے نہ تنہا کیجیے

مصلحت، روشنی پی جائے گی میخانہ کی
کوئی سمجھوتہ اندھیروں سے نہ ایسا کیجیے

میکدہ میں بھی میں ہو جاؤں گا تنہا تنہا
مجھ سے ماضی کی کوئی بات نہ پوچھا کیجیے

جشن زخموں کا اندھیروں میں منانا ہے مجھے
میری راہوں میں ابھی سے نہ اُجالا کیجیے

گونگے سناٹوں کا آسیب لپٹ جائے گا
آپ ویران مکانوں میں نہ جھانکا کیجیے

لذتِ غم میں تبسم ہی بہت کافی ہے
آنکھ بھر آئی تو آنسو نہ بہایا کیجیے

کچھ کہوں گا تو زباں کھینچ لی جائے گی مری
مجھ کو پڑھ لیجئے، حالات نہ پوچھا کیجیے

نکہتِ گل کہاں ٹھہرے گی چمن زاروں میں
آشیاں میرا جلا کر نہ تماشہ کیجیے

پیاس، صدیوں کی اتر آئے گی آنکھوں میں خیال
اجنبی بن کے مری سمت نہ دیکھا کیجیے





ڈھلی جو شب تو اُجالوں میں ڈوب جاؤں گا
ترے خیال کے پیکر تراشں لاؤں گا

غریبِ شہر ہوں پتھّر نہ پھینکیے مجھ پر
میں آئینہ ہوں محبّت کا ٹوٹ جاؤں گا

تجھے خبر ہے کہ صدیوں کا کرب ہے مجھ میں
میں کس طرح تری محفل میں مسکراؤں گا

سمندروں کو بھی زہراب کر دیا تو نے
میں اپنی تشنہ لبی اب کہاں بجھاؤں گا

مسرّتوں کا اگر یونہی جال پھیلے گا
میں آنسوؤں کے سمندر میں ڈوب جاؤں گا

یہاں تو سایۂ دیوار بھی نہیں باقی
تمہارے شہر میں اب سر کہاں چھپاؤں گا

مزاجِ روشنی کیا ہے مجھے سمجھنے دو
میں ذرّے ذرّے کو سورج کا گھر بناؤں گا

تم اپنے آپ کو قاتل کی صف میں پاؤ گے
نقاب، صبح کے چہرے سے جب اُٹھاؤں گا

خموشیوں کا یہاں کون ساتھ دے گا خیالؔ
مسرّتوں کا اگر جشن میں مناؤں گا





قافلے والوں کو لٹتے ہوئے اکثر دیکھا
ہم نے میلوں میں بھی تنہائی کا منظر دیکھا

رت جگے کتنے ہوئے میکدے سجنے کیلئے
صبحِ دم ہم نے ہر اک جام میں خنجر دیکھا

اپنے ہی چہرے کی لکھی ہوئی تحریر ملی
ہم نے اس شخص کے چہرے کو جو پڑھ کر دیکھا

زندگی تجھ سے ملاقات کہاں ہوتی ہے
ہم نے لیکن تجھے تنہائی میں اکثر دیکھا

کون جانے کہ زمانے کے ارادے کیا ہیں
ہم نے لمحوں کو بھی صدیوں کے برابر دیکھا

تم نے رنگین بہاروں کا کیا ذکر مگر
ہم نے گلشن میں ہر اک شاخ پہ خنجر دیکھا

حادثوں کے سوا کیا تھا مری راہوں میں خیال
اس نے کچھ دیر مرے ساتھ بھی چل کر دیکھا



فصلِ گُل آئی تو ہم پر کوئی احساں نہ ہوا
دل تو وہ شئے ہے کسی دور میں ویراں نہ ہوا

تم نے ہر طرح سے کی قتل کی سازش لیکن
پھر بھی اے دوست مرے قتل کا ساماں نہ ہوا

دار پر چڑھ گئے مہتاب اُگانے والے
جانے کیوں وقت اُجالوں کا نگہباں نہ ہوا

وہ تو ہر لمحہ ہوا قتل ترے کوچے میں
پھر بھی دیوانہ صلیبوں سے گریزاں نہ ہوا

یوں تو اِس شہر کی ہر شئے میں ہوئی تبدیلی
جانے کیوں تیرے بدل جانے کا امکاں نہ ہوا

ایک ایک پل میں کئی بار تجھے یاد کیا
زندگی میں ترا شرمندۂ احساں نہ ہوا

فائدہ کیا ہوا شعلوں کو بجھانے سے خیال
تذکرہ اپنا چمن میں کسی عنواں نہ ہوا



قدم قدم پہ بہاروں کا کارواں ہے میاں
مگر نسیمِ سحر، گُل سے بدگماں ہے میاں

بجھے گی کیسے مری تشنگی نہیں معلوم
سمندروں کا دلاسہ بھی رائگاں ہے میاں

تمہارے جسم کی ہر رگ لہو سے خالی ہے
تمہاری بزم میں ہر شخص بے زباں ہے میاں

اندھیرے گھیر چکے ہیں سحر کے چہروں کو
اِدھر نہ آؤ یہاں روشنی کہاں ہے میاں

یہ کس مقام پہ پہنچا دیا ہے یاروں نے
ہر ایک لمحہ مرا اب رواں دواں ہے میاں

علاقہ نور کا تاریک بن نہ جائے کہیں
مکانِ صبح پہ بھی شب کا سائباں ہے میاں

ہر ایک شخص یہاں خود نما مسافر ہے
نئے سفر کے لئے ہم سفر کہاں ہے میاں

خیالِ فصلِ بہاراں کی بات کیسے کرے
ہر ایک شاخ پہ خنجر کی داستاں ہے میاں



(ایک شعر)

سب کے چہروں پہ ہیں اخلاق و مروّت کے نقاب
کس کو اپنا یہاں اور کس کو پرایا کہیے



لگا کے آگ جو خوش ہیں مرے نشیمن میں
اُنھیں خبر نہیں پھیلے گی آگ ، گلشن میں

تمام رات مسیحا سے گفتگو میں کٹی
سحر ہوئی تو ہوئے قتل اپنے آنگن میں

بہار آ گئی زنجیر کون پہنے گا!
دِوانے ہو گئے ہشیار اب کے ساون میں

زباں کھلی نہ کسی کی بھی قاتلوں کے خلاف
بہت سے لوگ ہوئے قتل صحنِ گلشن میں

اُنھیں خریدنے نکلے ہیں شب کے سوداگر
ٹہل رہے ہیں جو کرنوں کے نرم آنگن میں

اسی لئے تو بہاروں سے لوگ ڈرتے ہیں
خیال پھولوں کا سودا ہوا ہے گلشن میں



عجیب خواب تھا جو ہم نے شب میں دیکھا تھا
سمندروں پہ بھی تشنہ لبوں کا میلہ تھا

خزاں کے ساتھ جو چلنا تمھیں گوارا تھا
بھری بہار کا بھی اہتمام کرنا تھا

اُسی کے سینے میں صدیوں کا کرب اُترا ہے
وہ جس نے بھاگتے لمحوں کو قید رکھا تھا

خوشی کا آج وہ زہراب پی گیا شاید
تمہارے آنے سے پہلے دیوانہ اچھا تھا

وہ شخص کون تھا کیا نام تھا نہیں معلوم
جو زندگی کی طرح ساتھ چلتا تھا

اسی کا دستِ کرم تم نے کر دیا مجروح
سفر میں جس نے تمھیں راستہ بتایا تھا

اُسے کناروں نے گہرائیوں میں پھینک دیا
جو سطحِ آب پہ موتی تلاش کرتا تھا

لہو لہو کا تھا چرچہ خیال گلشن ہیں
خِرد کا کھیل بہاروں کے ساتھ کیسا تھا



(ایک شعر)

کل جو سُورج کی کِرن گھول کے پی جاتے تھے
آج شبنم کے طلب گار ہوئے ہیں شائد



مہرباں جو ہیں ہمارے وہ ستمگر تو نہیں
ان کے ذہنوں میں شر انگیزی کا نشتر تو نہیں

بس تو اک عمر سے ہوں خون کی گردش کی طرح
تھک کے جو بیٹھ گیا وہ ترا ہمسر تو نہیں

وہ جو تہذیب کے شیشوں کو سجانے آئے
ان کے ہاتھوں میں ذرا دیکھنا پتھر تو نہیں

جو اُجالوں میں رہا کرتے ہیں سہمے سہمے
وہ خیالات کے ٹھہرے ہوئے ساگر تو نہیں

تھی زباں جن کی ترانوں کے لئے وقف کبھی
ان کے اب ذہن میں ٹوٹا ہوا نشتر تو نہیں

جن کو پھولوں کے علاقوں میں نہ آرام ملا
عمر بھر ان کے لئے کانٹوں کا بستر تو نہیں

وادیِ ظلمتِ شب میں جو اتر آئے ہیں
جاگتی صبح کے وہ لوگ پیمبر تو نہیں

تیری راہوں میں ہر اک ذرّہ ہے سورج کی طرح
نقشِ پا تیرا کہیں میرا مقدّر تو نہیں

جن کے ذہنوں سے کبھی سنگ پگھلتے تھے خیال
ذہن اب اُن کا کہیں خشک سمندر تو نہیں





زمانہ کھوکھلے ذہنوں کی سازشوں کا ہے
یہاں ضمیر کی آواز کون سنتا ہے

غضب ہے درد کے پیکر تراشنے والا
تمام شہر کی خوشیاں سمیٹے بیٹھا ہے

میں کیسے گردشِ دوراں سے احتجاج کروں
مجھے خود اپنی ہی تنہائیوں نے گھیرا ہے

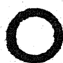
زبانیں ان کی اندھیروں نے کھینچ لی شاید
تمہارے شہر میں ہر شخص گونگا لگتا ہے

جو آئینے کے مقابل ہیں وہ بتائیں گے
نویدِ صبح کا کیا حشر ہونے والا ہے

ہمارے خون کی لہریں کہاں کہاں پہنچیں
سمندروں کی تہوں میں بھی اب اُجالا ہے

عبث ہے فصلِ بہاراں کا اہتمام اے دوست
ابھی چمن میں بہت دُور تک اندھیرا ہے

غمِ حیات سے چاہا تھا گفتگو کرلوں
ترے خیال نے پھر آج مجھ کو گھیرا ہے



(ایک شعر)

وہ شخص جو تنہائی کے صحرا میں کھڑا ہے
سب حالِ چمن اس کے ہی چہرے پہ لکھا ہے



کونسا زہر ہے ساقی ترے پیمانوں میں
سب کے سب ہو گئے شامل ترے دیوانوں میں

دھڑکنیں دل کی مری اِن میں ہیں شامل شاید
ورنہ کیا رکھا ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں میں

اُن کی قسمت میں تو محفل کا اندھیرا بھی نہیں
جو چراغوں کی طرح جلتے ہیں ایوانوں میں

آج کی بات نہیں سوچ لو کل کیا ہو گا
کچھ نئے نام اُبھر آئے ہیں میخانوں میں

ہم بُرے ہوں کہ بھلے اپنی جگہ ہی خوش ہیں
ہم کو شامل نہ کرو شہر کے فرزانوں میں

کتنے پیاسے ہیں یہاں تم نے یہ دیکھا ہوتا
یہ تو سچ ہے کہ بہار آئی ہے میخانوں میں

عاقبت اپنی سنور جائے گی پی لوں گا خیال
اُن کی آنکھوں کے اگر پھول ہوں پیمانوں میں



اُنھیں کو سینۂ شب میں اُترتے دیکھا ہے
دیارِ صبح کا نقشہ جنھوں نے کھینچا ہے

فریبِ قُرب میں کتنے ہی مبتلا ہیں مگر
ترے مزاج کو دراصل کس نے پایا ہے

تبسّموں کا اُجالا کرم نہیں ہوتا
غمِ احتیاط کا دھیما سا ایک شعلہ ہے

جُنوں کی راہ سے نزدیک ہے تمہاری گلی
براہِ دیر و حرم اک طویل پھیرا ہے

اگر خُلوص نہیں ہے تو دل نہ توڑو تم
سُنا ہے حُسنِ طبیعت ہی حُسن ہوتا ہے

مسرّتوں نے منائے ہیں کتنے جشن مگر
رخِ حیات پہ اب تک بھی غم کا غازہ ہے

نہ پوچھئے دلِ فیض الحسن خیالؔ کا حال
دیارِ درد میں شب ہے نہ تو سویرا ہے



دلوں میں زہر ہے ، اندازِ مخلصانہ ہے
نہ جانے شہر میں کِس کِس کو آزمانا ہے

نگاہِ دوست ترا ظرف آزمانا ہے
خلوصِ پیار کا ماحول تاجرانہ ہے

جو درد آپ نے بخشا وہ جاں نواز نہیں
مجھے تو سلسلۂ غم میں ڈوب جانا ہے

چمن میں چہرے بدل کر نہ کیجیے تفریح
خزاں کا قرض اگر آپ کو چکانا ہے

جو پتّے پتّے کا قاتل ہے اس سے کہہ دیجیے
ہمارے ہاتھ میں اشجار کا خزانہ ہے

نہ جانے کب مرے زخموں کی جاگ اُٹھے قسمت
گلوں سے مصلحتاً رابطہ بڑھانا ہے

جو شام ہوتے ہی رستوں کی طرح تھک جائیں
بساطِ گل پہ بھی چلنا انھیں سکھانا ہے

خرد کے حلقوں میں تحریک چل رہی ہے یہی
اُسی کا قتل کرو جو یہاں دیوانہ ہے

بلاؤ اُس کو بھی پھولوں کی انجمن میں خیال
مزاجِ دوست بھی سنتے ہیں عاشقانہ ہے





خوشی کا درد کا سنگم رہا ہے آنکھوں میں
ترا خیال مجسّم رہا ہے آنکھوں میں

غمِ حبیب جو کم کم رہا ہے آنکھوں میں
اک انتشار کا عالم رہا ہے آنکھوں میں

تماشہ شب کا ابھی ختم ہونے والا ہے
مگر سحر کا لہو جم رہا ہے آنکھوں میں

دھندلکے کرنوں کا کشکول لے کے آئے ہیں
طلوعِ صُبح کا ماتم رہا ہے آنکھوں میں

جہاں پہ ٹوٹ گیا سلسلہ محبّت کا
وہیں سے سلسلۂ غم رہا ہے آنکھوں میں

اسی لئے تو میں تنہا پسند ہوں شاید
خموشیوں میں وہ ہمدم رہا ہے آنکھوں میں

رہیں نہ خیال کے دامن میں اس کی خوشبوئیں
اسی لئے تو وہ بیہم رہا ہے آنکھوں میں



فصلِ گُل کا تمہیں پیغام سُناؤں کیسے
آگ پھر اپنے نشیمن میں لگاؤں کیسے

دوستو وقت کی ہمدردیاں رہنے دو ابھی
سینکڑوں زخم ہیں دل میں، میں بتاؤں کیسے

اپنے ہی درد کی پہچان نہیں ہے جس کو
حالِ دل ایسے مسیحا کو سُناؤں کیسے

لوگ حالات سے سمجھوتہ کئے بیٹھے ہیں
سب ہی خاموش ہیں، میں شور مچاؤں کیسے

لمحہ لمحہ جو کیا قتل نئی کرنوں کا
ایسے قاتل کو مسیحا میں بناؤں کیسے

پھول دامن میں سمیٹے ہوئے بیٹھے ہیں سبھی
پسِ گلشن ہیں جو حالات سناؤں کیسے

ہر گلی کوچے میں ہوں گے مرے قدموں کے نشاں
اجنبی بن کے ترے شہر میں آؤں کیسے

حالِ دل مجھ سے کوئی پوچھنے آیا ہے خیال
زخمِ دل اپنے ، میں ہر اک کو دکھاؤں کیسے



ایک شعر

جو جلا رات کی تنہائی میں اس پر بھی خیال
بے وفائی کا ہے الزام تمہیں کیا معلوم



مدھر گیتیں سُناتی تھیں جو شاخیں بن میں ساون کی
ہوئی ہے ان ہی گوشوں میں فضا نمناک گلشن کی

جہاں لمحے کئی صدیوں کی باتیں پُوچھ لیتے ہیں
وہاں تاریخ مل جائے گی قاتل کی بھی رہزن کی

خزاں کے پاؤں میں بھی گھنگروں کے بول پھوٹے ہیں
کہ شاید پھیلنے والی ہے خوشبو تیرے دامن کی

جہاں تفصیل سے دو چار باتیں کر نہیں سکتے
وہاں کیسے سنائیں داستاں ہم اپنی اُلجھن کی

لپٹ جائے گی سناٹوں سے شب کا خون پی لے گی
سسکتی آگ جو پھیلی ہے دیوانے کے دامن کی

چلو اب تیشۂ نورِ سحر کی روشنی لے کر
حصاریں منہدم کر دیں گے اب قاتل کے آنگن کی

بہاروں کی زمیں پر چلنے والے تھک گئے شاید
خیالؔ اب روشنی میں بھی ہے رنگت سانولے پن کی



جو سلیقے سے تجھے یاد کیا کرتے ہیں
دُور رہ کر بھی ترے پاس ہوا کرتے ہیں

کس طرح شہر کے وہ لوگ محافظ ہوں گے
اپنی تہذیب پہ جو وار کیا کرتے ہیں

جب اُجالوں کی زمیں پر بھی نہیں چل سکتے
لوگ کیوں جہدِ مسلسل کی دُعا کرتے ہیں

اپنے ہی خون سے کھیلیں گے وہ ہولی شاید
بدحواسی میں جو زہراب پیا کرتے ہیں

مسکراتے ہوئے آنسو جو نہیں پی سکتے
عمر بھر پیاس کے صحرا میں رہا کرتے ہیں

جن کی نظروں میں اُبھرتا ہی نہیں نقشِ وفا
کیوں وہ احباب کے چہروں کو پڑھا کرتے ہیں

کونسا شہر ہے ہم لوگ کہاں آئے خیال
لوگ جسموں کو بھی نیلام کیا کرتے ہیں



(دو شعر)

کھڑا ہے دشمنِ جاں سر اُٹھائے مقتل میں
نمازِ عشق دیوانوں کی پھر بھی جاری ہے

جفا پہ ناز ستم پر تمہارے خوش ہیں ہم
مگر یہ کیا ہے وفاؤں کی پاس داری ہے



عزّتِ نفس نے خود اپنا تماشہ دیکھا
تشنگی اور بڑھی ہم نے جو دریا دیکھا

رات کے زخم کبھی سُرخ سویرا دیکھا
ہم نے مزدور کی پیشانی پہ کیا کیا دیکھا

زندگانی کی علامت ہے کہ چلتے رہیئے
ہم نے مایوسی کے چہرے پہ اُجالا دیکھا

اب چمن والے بھی محتاجِ تعارف نہ رہے
ہم نے پھُولوں سے بھی اب زہر پگھلتا دیکھا

میں نے تنہائی کے دروازے پہ دستک دی تھی
جو کھُلا در، تو وہاں اپنا ہی چہرہ دیکھا

کونسا شہر ہے یہ شب کی نگہبانی میں
زندہ جسموں کا جہاں ہم نے جنازہ دیکھا

رونقِ بزم رہے جس کے جنوں کے چرچے
ہم نے اُس شخص کو میلوں میں بھی تنہا دیکھا

فاصلے صدیوں کے لمحوں میں اُتر آئے خیال
تم نے سہواً مری جانب جو دوبارہ دیکھا



(ایک شعر)

ضرور نکھرے گا اب اہلِ کارواں کا لہو
خیالِ چہرۂ رہبر پہ شرمساری ہے



کام کی بات نگل جاتے ہیں بہرے سائے
رنگ چہروں کا اُڑا دیتے ہیں ٹھہرے سائے

صبح کا جسم اندھیروں سے لپٹ جاتا ہے
کیا اُجالوں کو ڈراتے ہیں یہ گہرے سائے

اب سمندر بھی مری پیاس بجھائے کیسے
بن گئے ہیں درِ میخانہ کے پہرے سائے

رات کے زہر کو پیمانوں میں رہنے دیجے
رازِ میخانہ کا پی جائیں گے بہرے سائے

وہ سرِ بزم اُجالوں کا پتہ دیتے ہیں
شب کی باہوں میں جو اُبھرے ہیں سنہرے سائے

کس طرح دوستو چھلکیں گے اُجالوں کے ایاغ
روشنی پی گئے میخانہ کی گہرے سائے

مصلحت کھا گئی سچائی کے پودوں کو خیال
جھوٹ کی بیل بڑھانے یہاں ٹھہرے سائے



نظرِ قاتل سے پھر اب لڑ گئی ہے
مقابل زندگی کے زندگی ہے

جفاؤں میں بھی شانِ دلبری ہے
ہمارا تذکرہ کیوں سرسری ہے

چلو میخانہ سے اُٹھ کر کہیں اب
یہاں بھی شیخ کی ہی چل رہی ہے

خیال آیا تھا اک دن تیرے گھر کا
ابھی تک میرے گھر میں روشنی ہے

اگر قاتل کو ہم سمجھیں مسیحا
تو دیوانے کی جاں پھر کس نے لی ہے

جہاں سورج کی باتیں ہو رہی تھیں
وہاں بھی روشنی اب سو رہی ہے

خیالؔ آؤ چلیں اب میکدہ ہم
کسی کی زُلف پھر لہرا رہی ہے



ترے کرم نے اُسی شخص کو پکارا ہے
زمانہ جس کو سمجھتا تھا بے سہارا ہے

جو ہم سے کل یہاں پھولوں کی بات کرتا تھا
اُسی نے آج چمن سے ہمیں نکالا ہے

وہ جس کے ہونٹوں پہ خوشبو مہکتی رہتی تھی
اُسی کے ہاتھوں سے اب زہر ملنے والا ہے

اِدھر نہ آیئے خوشیوں کا آئینہ لے کر
ابھی تو زخموں کو تنہائی کا سہارا ہے

لہو لہو کا جہاں تذکرہ ہو شام و سحر
وہ شہر میرا نہیں دوستو تمہارا ہے

جو چہرے پڑھنے کے قابل ہیں ان کو پڑھ لیجیے
نقاب ہم نے ہر اک چہرے سے اُتارا ہے

ہجومِ غم سہی بیتاب ہے گا پھر بھی خیال
اِسی لئے تو ترا ہر ستم گوارا ہے



بے خودی رندوں کی جب میخانہ میں گھُل جائے گی
سینۂ شب میں اُتر کر روشنی پھیلائے گی

زندگی جب درد کا پیغام لے کر آئے گی
وقت کے چہرے پہ بھی سنجیدگی آ جائے گی

قتل لمحوں کا اگر ہوتا رہے گا شہر میں
زندگی کی ہر گھڑی پھر اک صدی بن جائے گی

گفتگو جب بھی کرے گی مجھ سے تنہائی مری
جائزہ لے کر مری اُلجھن سے وہ گھبرائے گی

ہم سحر کی خوش نما راہوں پہ چل سکتے نہیں
روشنی اُس کی نہ جب تک سب کے گھر میں آئے گی

یوں ہی میرا خون دُنیا میں اگر بکتا رہا
کج کلاہی شب کی، سورج کا مکاں بن جائے گی

آج طے کرنا ہے ہم کو منزلوں کے فاصلے
آنے والی رُت نہ جانے رنگ کیسا لائے گی

فرشِ گُل پر کچھ نہ کچھ آرام مل جاتا ہمیں
جانے کب یہ زندگی پھولوں پہ چل کر آئے گی

وحشتِ خوں میں پھر اُگیں گے پیار کے پودے خیالؔ
جب خوشی کو بے بسی غم کا کفن پہنائے گی





تمام عمر رکھا جس نے بے قرار مجھے
نفس نفس میں اسی کا ہے انتظار مجھے

کبھی جو میں نے کیا تذکرہ نشیمن کا
چمن میں دینی پڑی قیمتِ بہار مجھے

تمام نور کی کرنوں پہ میرا قبضہ ہے
ابھی ہے دوستو سورج پہ اختیار مجھے

روایتوں کو کرو دفن شب کے سینے میں
سفر اجالوں کا کہتا ہے بار بار مجھے

نہ پوچھ تو مری الجھن کی داستاں کیا ہے
ہر اک صدی میں رہا تیرا انتظار مجھے

خیال اس کی محبت ہی کام آئے گی
وہ جس نے تحفے دیئے غم کے بار بار مجھے



خوابوں کی بات جاگتے لب پر ٹھہر گئی
محفل کی بات سینۂ شب میں اُتر گئی

محرومیوں کا واسطہ دینا پڑا ہمیں!
رُوداد بے رُخی کی جو حد سے گزر گئی

جب بن بُلائے آپ گلستاں میں آ گئے
پھولوں کی ٹہنیوں کی بھی مستی اُتر گئی

رستے میں رُک گئی ہے مرے دل کی کائنات
کیا میرے غم کی بات مسرت کے گھر گئی

گلشن کا تذکرہ بھی تو ممکن نہیں رہا
صحرا کا سلسلہ ہے جہاں تک نظر گئی

ہم نے جو خشک پتّوں پہ لکھا کسی کا نام
صدیوں کی بات لمحوں کے دل میں اُتر گئی

معصوم لوگ زد میں خود ہی آ گئے خیالؔ
پتّھر چلایا کس نے بَلا کس کے سر گئی



چھیڑ کر سازِ جنوں سولی پہ چڑھ جاتے ہیں لوگ
ہائے کتنی خوب صورت سی سزا پاتے ہیں لوگ

روشنی پی کر اندھیروں میں بھٹک جاتے ہیں لوگ
فصلِ گل میں بھی پریشاں کیوں نظر آتے ہیں لوگ

شب کی باہوں میں وہی تھے دوستو خنجر بکف
صبح دم جو چارہ گر کے روپ میں آتے ہیں لوگ

سوکھی شاخوں پر گھنیرے بادلوں کا رقص ہے
انقلاب آتا ہے جب حد سے گذر جاتے ہیں لوگ

لمحہ لمحہ خون پی کر زندگی کے نام سے
فاصلہ صدیوں کا بن کر خود ہی پچھتاتے ہیں لوگ

آنسوؤں کے موتیوں کو جب کوئی چُنتا نہیں
گیت کیوں اس انجمن میں پیار کے گاتے ہیں لوگ

مطمئن کس طرح ہو سکتے ہیں اربابِ چمن
مُسکرا کر جب چمن میں شعلے برساتے ہیں لوگ

غالباً تنہائیوں نے گھیر رکھا ہے اُنھیں
خالی خالی ہاتھ کیوں گلشن سے آجاتے ہیں لوگ

کیا اُجالوں کے بدن بھی بے وفا نکلے خیالؔ
کیوں لباسِ صبح کی خوشبو سے گھبراتے ہیں لوگ





مصلحت وقت کی اک جنسِ گراں ہو جیسے
ریت کے شہر میں پانی کا مکاں ہو جیسے

کشمکش درد کی اب مشکلِ جاں ہو جیسے
تپتے صحراؤں میں بھی آبِ رواں ہو جیسے

زہرِ تنہائی کو میں پی گیا ہنستے ہنستے
دشمنی بھی تری اب راحتِ جاں ہو جیسے

ہم اندھیروں سے کئے بیٹھے ہیں سمجھوتہ یہاں
تذکرہ صبح کا اب وہم و گماں ہو جیسے

آئینہ خانہ میں وہ ہو گئے ایسے گم سم
میرے زخموں کی بھی تصویر یہاں ہو جیسے

لوگ بچوں کی طرح دن میں بھی ڈرتے ہیں خیالؔ
کوئی آسیب اندھیروں کا یہاں ہو جیسے



کھلے جو پھول ترے پیرہن کی یاد آئی
چلی صبا تو ترے بانکپن کی یاد آئی

چلے تو گنگ و جمن، تھم گئے تو تاج محل
ہنسے جو آپ تو صبحِ دکن کی یاد آئی

غزل ہے پیار، غزل ہے ادائے دوشیزہ
غزل سنائیے پھر گل بدن کی یاد آئی

مہک رہی ہے غزل گیسوؤں کی خوشبو سے
کسی مہکتے لہکتے بدن کی یاد آئی

غمِ حیات کی تلخی نے جب ملا لی نظر
ہمیں بھی ایسے میں اک بے وطن کی یاد آئی

بھٹک رہا تھا جو ویران شاہراہوں پر
ہر ایک گام اسے انجمن کی یاد آئی

خموش نغموں سے بھی آج اُٹھ رہا ہے دھواں
قفس نصیب کو شاید چمن کی یاد آئی

خیال دل میں جو لہرائیں ریشمی یادیں
کسی کی زُلفِ شکن در شکن کی یاد آئی



(ایک شعر)

اُن کے ہاتھوں میں چراغِ سحری ہے یارو
جن کو معلوم نہیں صبح بھی کب ہوتی ہے



رات کچھ اور بھی ڈھل جائے تو پھر کیا ہو گا
روپ چہروں کا بدل جائے تو پھر کیا ہو گا

شمعِ رخِ گل نہ کرو ورنہ کوئی پروانہ
اپنی ہی آگ میں جل جائے تو پھر کیا ہو گا

فصلِ گل آئی دبے پاؤں درِ زنداں پر
غم کی زنجیر پگھل جائے تو پھر کیا ہو گا

آئے ہیں پچھلے پہر بھی کئی میکش ساقی
آخری دور بھی چل جائے تو پھر کیا ہو گا

آنسوؤں کو مری پلکوں پہ ابھی رہنے دو
پھول سا ہاتھ بھی جل جائے تو پھر کیا ہو گا

کوئی آنسو نہ گرے شہرِ تمنّا میں خیال
ورنہ یہ شہر ہی جل جائے تو پھر کیا ہو گا



پردے تکلّفات کے یوں درمیاں رہے
وہ میرے دل میں رہ کے نظر سے نہاں رہے

ہم بھی شریکِ فصلِ بہاراں رہیں گے دوست
محفوظ بجلیوں سے اگر آشیاں رہے

آئی بہار جھوم کے چھائی وہیں گھٹا
یارب اسیرِ گیسوئے جاناں جہاں رہے

یارب دُعا ہے میری، ملوں ان سے جب کبھی
دل اختیار میں رہے، بس میں زباں رہے

کرتا رہا میں ضبط کی کوشش مگر خیال
آنکھوں سے میری اشکِ مسلسل رواں رہے



ہر ذرّہ آفتاب تری رہگذر کا ہے
لیکن سوال صرف شعورِ نظر کا ہے

ہر سمت رنگ و نُور ہے ہر سمت ہے شباب
وہ آ رہے ہیں یا یہ اُجالا سحر کا ہے

منزل کی جستجو میں ہوئے اِتنے بدحواس
رہزن پہ بھی گمان ہمیں راہبر کا ہے

بڑھتے ہی جائیں گے رہِ مہر و وفا پہ ہم
رستہ اگرچہ یہ بڑے خوف و خطر کا ہے

ناسُور بن چکے ہیں مرے زخمِ دل خیالؔ
احسان یہ بھی ایک، مرے چارہ گر کا ہے



حالات کہہ رہے ہیں کہ تو رُوبرو رہے
سانسوں میں تو رہے مری نس نس میں تو رہے

پیکر تراش لوں گا میں آواز کا تری
تنہائیوں میں تجھ سے اگر گفتگو رہے

سُولی پہ چڑھ گئے ہیں کئی لوگ اس لئے
اے عشق کچھ نہ کچھ تو تری آبرو رہے

پتھر میں بن گیا ہوں تری رہ کا اس لئے
ہر روز نقشِ پا سے ترے گفتگو رہے

ایسا نہ کر زمانے سے تو ہم کو بے خبر
صحرا نورد ہم رہے محفل میں تو رہے

تیرا خیال لے کے چلوں گا میں عمر بھر
ٹھہروں گا اس جگہ پہ جہاں تو ہی تو رہے



جو دامنِ شب میں کبھی مہمان رہے ہیں
آثارِ سحر اب اُنھیں پہچان رہے ہیں

اے دوست ترا حُسنِ تکلّف تو بجا ہے
ہم تیری توجہ سے پریشان رہے ہیں

دانش تمھیں پتّھر کا صنم مان رہی ہے
ہم تم کو محبت کا خدا مان رہے ہیں

غم دوست ہوں میں، میرے تبسّم پہ نہ جاؤ
پوشیدہ خموشی میں بھی طوفان رہے ہیں

ہر منزلِ سجدہ سے جبیں کو ہے عقیدت
ہم نقشِ قدم آپ کے پہچان رہے ہیں

دیکھی نہ گئی خسروِ خوباں کی ندامت
وہ اپنی جفاؤں پہ پشیمان رہے ہیں

کس طرح خیال اُلجھے ہوئے ہم نہیں رہتے
گیسوئے نگاراں جو پریشان رہے ہیں



گُل بدن، ہم سفرِ راہِ وفا کیا ہو گا
چھوڑ کر فرشِ چمن آبلہ پا کیا ہو گا

ایک مدت سے ترے پاؤں کی آہٹ بھی نہیں
وادیٔ دل میں خموشی کے سوا کیا ہو گا

میری پلکوں پہ ستارے ہی ستارے ہوں گے
تیرے ہونٹوں پہ تبسّم کے سوا کیا ہو گا

خونِ دل، خونِ جگر، خونِ تمنّا کے سوا
آخرِ شب مری پلکوں پہ رہا کیا ہو گا

جنبشِ لب کی اجازت بھی نہ دیں گے آدابِ
سامنے تم ہو تو پھر تم سے گلہ کیا ہو گا

اجنبی بن کے ترے شہر میں ہوں آوارہ
جادۂ شوق میں جانے ابھی کیا کیا ہو گا

رات بھر جلتے رہے شمع کی مانند خیال
دیکھنا یہ ہے کہ انجامِ وفا کیا ہو گا



تمھاری یاد کے فانوس جب چمکتے ہیں
نہ جانے کتنی اُمنگوں کے دل دھڑکتے ہیں

چمک میں تاج محل سے بھی خُوبصورت ہیں
شبِ فراق جو آنسو مرے ٹپکتے ہیں

جنھیں ترے لب و عارض کی سُرخیاں نہ ملیں
وہ کم نگاہ بہاروں کے منہ کو تکتے ہیں

وفا کی راہ میں کس طرح ہم سفر ہوں گے
وہ فرشِ گُل پہ چلیں بھی تو پاؤں تھکتے ہیں

شباب و حسن کا اک ایسا امتزاج ہو تم
نگاہِ شوق سے سب پھُول تم کو تکتے ہیں

گزر کے دیکھ ذرا تو بھی غم کی راہوں سے
شبِ فراق ستارے بھی کم چمکتے ہیں

فرازِ عرش سے ٹکراتا ہے تصوّر بھی
ترے خیال میں جب آنکھ ہم جھپکتے ہیں



میخوار کو لگے ہیں جہاں بے خودی کے زخم
عابد بھی کھا رہے ہیں وہاں بندگی کے زخم

سو قافلے بہار کے رُک جائیں بھی تو کیا
گُل بار ہو گئے ہیں تری کج روی کے زخم

فیضانِ میکدہ ہے کہ ہم پڑھ چکے نماز
زاہد تو گن رہا ہے ابھی زندگی کے زخم

خود آگہی نہیں تو خُدا آگہی کہاں
بے وجہ کھا رہی ہے خِرد آگہی کے زخم

ایسا سلوک ہے کہ سمجھ میں نہ آسکا
یہ دوستی کے زخم ہیں یا دشمنی کے زخم

جب سے ہوئی ہے فکرِ خریدارِ صبحِ نو
روشن خیال پر بھی لگے تیرگی کے زخم

محرومئ کرم سے ہی مخمور ہوں خیالؔ
چھیڑو نہ مُسکرا کے مری تشنگی کے زخم



آپ گلشن میں مرے ساتھ جو دو گام چلے
کتنے ہی دوست پریشان کھڑے ہاتھ ملے

میکدہ میں جو ترا ذکر چلا رات ڈھلے
سرِ مژگاں کئی فانوس بجھے دیپ جلے

ان کی راہوں میں اُجالے ہی اجالے ہوں گے
وہ مسافر جو اندھیروں میں قرینے سے چلے

آپ کچھ تو لبِ گلنار کو جنبش دیجئے
کس طرح پاؤں کی زنجیر کٹے دیپ جلے

گُل نہ کردیں وہ چراغِ سحرِ نو ہمدم
روشنی میں بھی جو ملتے ہیں اندھیروں سے گلے

ان کا دامن ہی شکایت کا خریدار رہا
اپنے ظاہر سے نظر آتے ہیں جو لوگ بھلے

چاندنی رات میں بھی پاؤں جلے اُن کے بغیر
فرشِ گُل پر وہ تکلف میں اکیلے جو چلے



ہر گوشہ بساطِ غزل ہے سجا ہوا
تیرا شباب مرکزِ فن ہے بنا ہوا

اے دل کرم کی آس میں کیوں مبتلا ہوا
پورا کہاں کسی کا کوئی مدعا ہوا

کس کو سنائیں فصلِ بہاراں میں کیا ہوا
دامانِ آرزو ہے ابھی تک پھٹا ہوا

کیا تیری زندگی میں کوئی حادثہ ہوا
کیوں میری طرح تیرا بھی ہے دل بجھا ہوا

دستِ ہوس کے بعد بہاروں پہ کیا بنی
بھنورا تو اڑ گیا ہے گلِ تر کا کیا ہوا

پھولوں کی آرزو میں لبِ خار تک گئے
دامانِ آرزو ہے لہو سے رنگا ہوا

الزام دیجیے نہ کسی کی نگاہ کو
ان کا خیال خود ہے تماشہ بنا ہوا



اشکوں کے دیپ ہم نے جلائے وہاں وہاں
اُبھرے تمہارے نقشِ کفِ پا جہاں جہاں

ہم تھے حیات و موت کی راہوں کے درمیاں
ایسے میں اتفاق سے آپ آ گئے یہاں

مجھ سے بہت قریب تھے لب ہائے زرفشاں
آنکھوں میں آج تک وہ حسیں خواب ہے جواں

دھندلا رہے ہیں پھر تری یادوں کے ماہتاب
بڑھنے لگی ہیں پھر غمِ دوراں کی تلخیاں

کُلیاں کھلاتی ہیں ترے انفاس کی نسیم
اے دوست گلستاں ہے ترے دم سے گُلستاں

کیا اجنبی دیار کے پھولوں کی آرزو
رہتا ہوں تیرے شہر میں کانٹوں کے درمیاں

ہر منزلِ حیات میں رہتا ہوں مطمئن
وہ عالمِ بہار ہو یا عالمِ خزاں

میری ہر اک غزل کا ہے تو مرکزِ خیال!
رنگینیٔ قلم ہے ترے غم کی جھلکیاں



(ایک شعر)

لوگ حالات کے حلقوں میں بٹے جاتے ہیں
زندہ رہنے کے لئے زہر پئے جاتے ہیں



صبر سے نا آشنا ہے، ضبط کا خوگر نہیں
آپ کے قابل جو ہو اپنا دلِ مضطر نہیں

دیکھئے رکھا ہے میں نے کس طرح غم کا بھرم
دل میں ہیں ناسور پھر بھی میری آنکھیں تر نہیں

اپنے اپنے رنگ میں کتنے ہی مل جاتے ہیں لوگ
میری نظروں میں کوئی بھی آپ سے بہتر نہیں

خواب بن کر رہ گئی ہے میکدہ کی زندگی
ساقیا جب سے تری چشمِ کرم مجھ پر نہیں

کارواں منزل پہ پہنچے کس طرح اپنا خیالؔ
آشنا راہوں کے پیچ و خم سے جب رہبر نہیں



نہ جانے وحشتِ دل کس مقام پر آئی
خوشی کا ذکر جب آیا تو آنکھ بھر آئی

ہوا قفس شکنی فرضِ اوّلیں میرا
بہار آتی ہوئی جب مجھے نظر آئی

ہر اک مقام سے دامن بچا کے گذرا ہوں
مرے خیال میں جب تیری رہگذر آئی

ہوا طویل اسیری کا یہ اثر ہم پر
قفس سے چھوٹے تو دُنیا نئی نظر آئی

جہاں غرض کا تھا ماحول اے خیالؔ وہاں
عجیب حال میں انسانیت نظر آئی



خوش ہوں کہ میرے حال کی اُن کو خبر تو ہے
دُنیا میں اپنا کوئی حقیقت نگر تو ہے

شکوہ نہیں کہ میں تری نظروں سے دُور ہوں
محفل میں تذکرہ مرا شام و سحر تو ہے

وارفتگیِ شوق میں سجدوں کے واسطے
کعبہ نہیں نصیب ترا سنگِ در تو ہے

تاروں کے ڈوبتے ہی ہوا کوئی جلوہ گر
میری دعائے نیم شبی میں اثر تو ہے

راہِ وفا میں آپ ہیں یا آپ کا خیال
کوئی نہ کوئی میرا شریکِ سفر تو ہے



زندہ اس کے لئے ہوں جو کرم ایجاد نہیں
اُس پہ مرتا ہوں جسے نام وفا یاد نہیں

ایک طوفان اُٹھا تھا یہ مجھے یاد تو ہے
کیسے ڈوبا ہے سفینہ یہ مجھے یاد نہیں

دل کا ہر زخم ہے ناسور کی صورت لے دوست
میرے ہونٹوں پہ مگر نالہ و فریاد نہیں

میری بربادی پہ اے زندگی دلگیر نہ ہو
مجھ سے کتنے ہی تری راہ میں برباد نہیں

زندگی میں نہ ہو، گر دردِ محبت کی کسک
زندہ رہنے کا مزہ اے دلِ ناشاد نہیں

پی کے نکلا تھا تری بزم سے اِتنا ہے خیال
رات گذری ہے کہاں میری مجھے یاد نہیں



لہجہ ہمارا آپ کا انداز بن گیا
نزدیک رہ کے دُور کی آواز بن گیا

ہر آرزوئے جنبشِ لب نغمہ گر ہوئی
خاموشیوں کا نام یہاں ساز بن گیا

دل فطرتاً ازل سے تکلّف پسند تھا
لیکن حجابِ دوست کا غماز بن گیا

آنکھوں میں وارداتِ شب ماہ کا حجاب
کتنا حسین آپ کا انداز بن گیا

کس نام سے پکارا کریں دوستوں کو ہم
ہر شخص شہرِ گل میں ہم آواز بن گیا

جو دل مسرتوں کے لئے وقف تھا خیالؔ
تنہائیوں میں آپ کی آواز بن گیا



جَور بھی مجھ پر بہ عنوانِ محبّت کیجئے
رُوح پر چھا جائیے دل پر حکومت کیجئے

موت سے بدتر ہے بیشک بے حسی کی زندگی
دل میں پیدا درد کی انمول دولت کیجئے

میں محبّت آشنا ہوں آپ کو معلوم ہے
مجھ سے نفرت بھی بہ اندازِ محبت کیجئے

سلسلہ رکنے نہ پائے اِلتفاتِ جور کا
میرے حالِ زار پر اِتنی عنایت کیجئے

میکدہ میں امتیازاتِ مَن و تُو دیکھ کر
جی میں آتا ہے کہ ساقی سے بغاوت کیجئے

مُسکرا کر انتہائے غم کے عالم میں خیالؔ
احترامِ غم بہ عنوانِ مسرّت کیجئے



مدّت سے کسی کا کوئی پیغام نہ آیا
اے ذوقِ طلب جذبۂ دل کام نہ آیا

اک بار دیا تیری نگاہوں نے سہارا
پھر مرحلۂ گردشِ ایّام نہ آیا

ہم نے بھی نہ کی حسرتِ دیدار کی توہین
وہ صاحبِ جلوہ بھی سرِ بام نہ آیا

کس وقت تری یاد سے غافل تھا مرا دل
کس وقت مرے لب پہ ترا نام نہ آیا

چھلکا کوئی ساغر نہ گھٹا جھوم کے اُٹھی
جس روز خیال اُن کا سرِ شام نہ آیا



ہجومِ یاس سلامت خوشی کے چرچے ہیں
تبسّموں سے غمِ زندگی کے چرچے ہیں

حیات بن گئی شوریدگی محبّت کی
قفس میں بھی مری زندہ دلی کے چرچے ہیں

ٹپک رہا ہے لہو خار کے بھی دامن سے
کہاں کہاں مری تشنہ لبی کے چرچے ہیں

خُلوص بانٹ لیا ہے مرے عزیزوں نے
نگر نگر مری شائستگی کے چرچے ہیں

کبھی جو سانولی شاموں سے بھی گریزاں تھے
اُنھی کی بزم میں اب روشنی کے چرچے ہیں

جُنوں پسند عزیزوں کو دو دُعائیں خیالؔ
کہ شہر شہر مری کج روی کے چرچے ہیں



زُلفوں میں تری رُوحِ چمن جب سے بسی ہے
اے دوست تجھے نکہتِ گُل ڈھونڈ رہی ہے

منزل کی ہر اک آس دوراہے پہ کھڑی ہے
ہر راہ ترے نقشِ قدم مانگ رہی ہے

کم ہے خلشِ درد نہ اشکوں کی کمی ہے
اک شمع بجھی ہے تو نئی شمع جلی ہے

بکھری ہوئی زُلفوں کی گھٹا جھوم رہی ہے
دل میں بھی وہی کیفیتِ نیم شبی ہے

اے کشمکشِ درد ابھی شام ہوئی ہے
شمعِ نگہِ ناز کی لَو کانپ رہی ہے

یہ کون خیاؔل آج گلستاں میں ہے رقصاں
ہر پھُول غزل خواں ہے کلی جھوم رہی ہے



رُوبرو ہو کے جہاں آپ صدا دیتے ہیں
جرأتِ عرض کہاں ہوش اُڑا دیتے ہیں

میری وحشت کو وہ زُلفوں کی ہوا دیتے ہیں
یوں مرا ذوقِ جُنوں اور بڑھا دیتے ہیں

موجِ گُل جب بھی گزرتی ہے درِ زنداں سے
ہم تمہیں اور بھی جینے کی دعا دیتے ہیں

جن کے ویران تخیّل میں بسا ہے گلچیں
وہ بہاروں کا ہر اک نقش مٹا دیتے ہیں

تم تو محفل میں بھی انصاف نہیں کر سکتے
دار پہ چڑھ کے بھی ہم دادِ وفا دیتے ہیں

روشنی ان کے مقدّر میں کہاں ہوگی خیالؔ
جو سلگتی ہوئی شمعوں کو بجھا دیتے ہیں



دیوانے اعتبار کے پروانے بن گئے
بیچارے شمعِ درد کے نذرانے بن گئے

اِس دور کی نظر بھی ہے جلووں پہ معترض
یارو! حقیقتوں کے بھی افسانے بن گئے

ٹھنڈی ہے کتنی شمعِ رُخِ زر فشاں کی لَو
اربابِ بزم، جتنے تھے پروانے بن گئے

اب تک کسی کے آپ سمجھ میں نہ آ سکے
قصّے، کہانیاں کئی افسانے بن گئے

صدقے ترے خیالِ تبسّم نواز کے
ماضی کے زخم حال کے پیمانے بن گئے

واقف نہیں ہیں جو نگہہ کار ساز سے
پلکیں بھی مُسکرائیں تو مستانے بن گئے

دستورِ بارگاہِ محبّت نہ پُوچھئے!
نزدیک آنے والے بھی بیگانے بن گئے

یادوں کے پھول درد کی شمعیں ہیں ہم خیالؔ
بیٹھے جہاں بھی ہم وہاں کاشانے بن گئے



ایک شعر

جانے پہچانے ہوئے چہرے نظر آتے ہیں
وقت قاتل ہے یہاں کس کو مسیحا کہیئے



اُن کے اندازِ تخاطب کو کوئی سمجھا نہیں
سب سے ملتے ہیں کسی سے کوئی بھی رشتہ نہیں

کوئی عالم ہو مری دُنیا، مری دُنیا نہیں
جب تلک ہونٹوں پہ تیرا نام آ جاتا نہیں

مُسکرا دیتے ہو رودادِ وفا سُن کر مگر
اپنے دیوانے کو تم نے غور سے دیکھا نہیں

رونقِ محفل رہا جس کے جنُوں کا بانکپن
آج وہ دیوانہ محفل میں نظر آتا نہیں

ایک لہجہ کی پرستش کر رہا ہوں آج بھی
دیدۂ تخئیل نے جس کو کبھی دیکھا نہیں

میں کہاں اور التفاتِ دوست کی منزل کہاں
جیسے میرا ان بہاروں سے کوئی رشتہ نہیں

کیوں تجھے تصویر اپنی اب نظر آتی نہیں
کیا دلِ معصوم تیرا آئینہ ہوتا نہیں

راستوں پر جب تلک ساقی نہ چھڑکے گا شراب
میرا ظرفِ میکشی وہ آزما سکتا نہیں

بے تکلف ہو کے آئے ہو تو بیٹھو بھی خیالؔ
کیا تکلف آشنا، غم آشنا ہوتا نہیں





آپ اس خواب کی تعبیر بتائیں تو سہی
کوئی خوابوں میں رہا رات گزرتی ہی رہی

ہو گئے تیز قدم قافلۂ اشکِ رواں
تیرے آنچل کے کناروں کی جہاں بات چلی

یہی اچھا ہے کہ پھر ترکِ تمنّا کر لوں
شدّتِ غم میں مسیحائی بھی ناکام رہی

سامنے تیرے مروّت میں گلہ ہو نہ سکا
ورنہ بیمار بنا دیتی تری چارہ گری

تیری مخمور نگاہوں میں تھکن ہے رقصاں
مجھ کو ڈر ہے نہ کہیں اور بڑھے تشنہ لبی

منزلِ ترکِ تمنّا سے پرے ہیں ہم لوگ
جرأتِ ترکِ وفا آپ کی عادت ہی سہی

کیوں ستارے تری پلکوں پہ چمکتے ہیں خیالؔ
پیار کی تو نے کسی وقت بھی توہین نہ کی



دل ہے غمِ فراق ہے تاریک رات ہے
ہر لحظہ سکوت حدیثِ حیات ہے

اے دوست انتظار کہ تھوڑی سی رات ہے
پھر اک نئی سحر ہے نئی کائنات ہے

تیرے بغیر زیست المناک رات ہے
ہر تلخئ حیات، متاعِ حیات ہے

سب مطمئن ہیں تجھ سے مگر یہ نہ کھل سکا
کس پر عتاب کس پہ ترا التفات ہے

یا تم سے اتنا قرب تھا یا اتنا فاصلہ
یادِ نشاطِ رفتہ عذابِ حیات ہے

گرمِ سفر ہے قافلۂ وارثانِ صبح
آثار کہہ رہے ہیں کہ تھوڑی سی رات ہے

اک میرا حوصلہ ہی نہیں ضامنِ سفر
تیرا خیال بھی تو مرے ساتھ ساتھ ہے



تازگیِ لب و رُخسار کی خُوش بُو دے دو
اب ہمیں حُسن کے گلزار کی خُوشبو دے دو

دم نہ گھٹ جائے جواں سال تمنّاؤں کا
غم کی تعظیم کرو، پیار کی خُوشبو دے دو

جب کبھی وادیٔ وحشت سے گذر ہو جائے
اپنے پازیب کی جھنکار کی خُوشبو دے دو

تم تو خُود کِھلتا ہوا پھُول ہو کیا دو گے مجھے
جو گلے میں ہے اُسی ہار کی خُوشبو دے دو

موجِ گُل بن کے مہک جائیں گے اشعار مرے
ساعتو پیکرِ دِلدار کی خُوشبو دے دو

جرأتِ شوقِ نظارہ کو سراہا تم نے
اب ذرا لہجۂ اقرار کی خوشبو دے دو

آج افسردہ ہے تنہائی کی وحشت سے خیالؔ
تم ذرا گیسوئے خمدار کی خُوشبو دے دو



دلِ نازک پہ ہے ہر لمحہ گراں میرے بعد
اُن کی سانسوں پہ ہے شعلوں کا گماں میرے بعد

بُجھ گئی غالباً اک شمعِ وفا آخرِ شب
اب تری بزم سے اُٹھتا ہے دھواں میرے بعد

آپ پھُولوں کے تبسّم پہ بھروسہ نہ کریں
پھول ہو جائیں گے کانٹوں کی زباں میرے بعد

طنز اچھا نہیں بیمارِ محبّت کے لئے
آپ ہو جائیں گے مجبورِ فغاں میرے بعد

جو چمن اب ہے مرے حُسنِ نظر سے شاداب
کل نظر آئے گا دُنیا کو دھواں میرے بعد

ضبطِ غم کا کوئی معیار ہی باقی نہ رہا
ہو گئی قیمتِ غم اور گراں میرے بعد

کوئی پرچم نہ اُڑا فصلِ بہاراں میں خیال
بن گئی بادِ صبا میری فغاں میرے بعد



کسی کے جور و تغافل کو آشکار نہ کر
خدارا عشق کے دامن کو داغ دار نہ کر

ہر ایک گام پہ دیتی ہے نت نئے دھوکے
کسی مقام پہ دُنیا کا اعتبار نہ کر

خزاں کو رشکِ بہاراں بنا کے دکھلا دے
چمن پرست ہے تو ماتمِ بہار نہ کر

ہُجومِ درد سے گھبرا کے اے دلِ ناداں
کنارہ ضبط کی راہوں سے اختیار نہ کر

جہانِ شوق ہے یہ، اس میں اے فریبِ حیات
خوشی کے واسطے تُو غم کو شرمسار نہ کر

ستارے ڈوب رہے ہیں تو ڈوب ہی جائیں
خلوص کہتا ہے توہینِ انتظار نہ کر

خیال اُن کا سہارا ہے زندگانی کو
کسی سے ذِکر مگر، اُن کا بار بار نہ کر



میں جہاں پر بھی چلوں ، ساتھ چلے آیئے گا
خود بدل جائیں گے ، حالات چلے آیئے گا

دیر سے دشتِ تمنّا میں کھڑا ہوں تنہا
میری آنکھوں میں ہے برسات چلے آیئے گا

آپ آئیں تو سحر جاگ اُٹھے دن نکلے
وقت کی سانس پہ ہے رات چلے آیئے گا

لوگ انوارِ سحر سے بھی اُجالا مانگیں
جلوے بن جائیں نہ ظلمات چلے آیئے گا

گونج اُٹھیں نہ کہیں شہر کے بازاروں میں
میری تنہائی کے نغمات چلے آیئے گا

شبِ تنہائی ہے پلکوں پہ دیئے جلتے ہیں
جیسے تاروں کی ہے بارات چلے آیئے گا

ہم خیالؔ نگہہ شُعلہ نفس کے صدقے
زندگی آپ کی ہر بات چلے آیئے گا



تو نے دل کا کوئی ارمان نکلنے نہ دیا
آتشِ قرب میں جی بھر کے بھی جلنے نہ دیا

دی مجھے عرضِ تمنّا کی اجازت لیکن
اپنے ہونٹوں پہ تبسّم کو مچلنے نہ دیا

تیری آنکھیں مری پلکوں پہ نہ جھکنے پائیں
افقِ غم پہ نیا چاند نکلنے نہ دیا

ہم نے سوچا تھا بہت کھل کے کریں باتیں
لیکن آداب نے بھی حد سے نکلنے نہ دیا

جادۂ غم میں بڑا شوق تھا چلنے کا مگر
فرطِ احساس نے دو گام بھی چلنے نہ دیا

تیری آواز مرے درد میں تحلیل ہوئی
میری گیتوں نے تری یاد کو جلنے نہ دیا

سرد راتوں کو سلگنے نہ دیا تیرا خیال
میرے ہونٹوں کو ترے ذکر نے جلنے نہ دیا



اجنبی جان کے محفل سے اُٹھایا تم نے
اپنے دیوانے کو پہچان نہ پایا تم نے

نشۂ غم کو سلیقے سے بڑھایا تم نے
دل سے ہر درد کا احساس مِٹایا تم نے

فطرتِ عشق کی بیباک زباں بن کے کبھی
کیسے کیسوں کو صلیبوں پہ چڑھایا تم نے

آج تک کھُل نہ سکا بھید گلستاں کا مگر
بارہا ذِکرِ نشیمن کا سُنایا تم نے

میکشی جُرم نہیں اپنی تسلّی کے لئے
کس لئے جُرم کا احساس دلایا تم نے

ڈگمگاتے ہیں قدم راہِ وفا میں جب بھی
اپنے قدموں کا ہر اک نقش مٹایا تم نے

میرِ میخانہ نظر آتا ہے وہ آج خیالؔ
جس کو کل شب کسی محفل سے اُٹھایا تم نے



دردکے احساس کو جذبِ رگِ جاں کردیا
سوز نے ہر سانس کو آتش بداماں کردیا

عقل کی سنجیدگی شائستگی رخصت ہوئی
بے رُخی نے آپ کی کتنا پریشاں کردیا

جگمگا اُٹھے زمین و آسمان و بحر و بر
آپ نے جس سمت اپنا رُوئے تاباں کردیا

لا کے منزل کے قریں لُوٹی متاعِ عقل و ہوش
اک مسافر کو کہاں بے ساز و ساماں کردیا

فصلِ گُل ابرِ بہاراں اور پھر تیرا خیال
مجھ کو اس ماحول نے آخر غزل خواں کردیا



مسافروں کا اگر حوصلہ جواں ہوتا
نہ جانے کونسی منزل پہ کارواں ہوتا

میں اپنے آپ کو تجھ سے قریب کر لیتا
کچھ اور تو جو نظر سے مری نہاں ہوتا

بچائے بچ نہیں سکتا تھا مُبتلائے الم
کرم جو آپ بھی کرتے تو رائگاں ہوتا

تمہارے غم کی نوازش اگر نہیں ہوتی
مرا وجود بھی میرے لئے گراں ہوتا

تری گلی میں مری کائنات ہے ساری
وہاں اگر نہیں ہوتا تو میں کہاں ہوتا

ترا خیال جو کرتا کرم تصوّر پر
ترا جمال مرے دل میں ضُو فشاں ہوتا



ترا خیال تصوّر میں جب اُبھرتا ہے
مجھے طلوعِ سحر کا گماں گزرتا ہے

ہمیں ہیں جس کو نہ دی تم نے زندگی ورنہ
جہاں میں کون مسیحا نفس پہ مرتا ہے

بہار مانگنے آئی ہے گیسوؤں کی شمیم
چمن سے ہو کے کوئی گُلبدن گزرتا ہے

ہر ایک چیز سے بیگانگی ٹپکتی ہے
جہانِ شوق کا شیرازہ جب بکھرتا ہے

وہ دشت ہو کہ چمن، شہر ہو کہ ویرانہ
ترے قدم سے ہر اک راستہ سنورتا ہے

ستارے ڈوب گئے شمع بُجھ گئی لیکن
خیال تیرا ابھی انتظار کرتا ہے



شامِ میخانہ جو مہمان نظر آتے ہیں
صبح پڑھتے ہوئے قرآن نظر آتے ہیں

بزمِ یاراں میں نہیں ہم سا کوئی چاکِ جگر
یوں کئی چاکِ گریبان نظر آتے ہیں

دل میں امید کی پھر ایک کرن پھوٹی ہے
زندگی کے نئے سامان نظر آتے ہیں

کل جو آسودہ و خوش حال نظر آتے تھے
آج وہ سوختہ سامان نظر آتے ہیں

عشق کی کونسی منزل پہ خیال آ پہنچا
مرحلے راہ کے آسان نظر آتے ہیں



نوازشِ غمِ جاناں بھی ہے مگر کم کم
مری حیات ہے یا انتشار کا عالم

تری جفائے مسلسل کے شاہکار ہیں ہم
پناہ مانگنے آتے ہیں ہم سے جور و ستم

چمن میں نکہتِ گُل پھر رہی ہے آوارہ
بہار مانگنے آئی ہے تیرے نقشِ قدم

سلامت آپ کے رخسار و لب کی رنگینی
نہ ہوگی شمع تمنا کی روشنی مدھم

گزر کے دیکھ ذرا تو بھی راہِ اُلفت سے
کہ کس قدر ہے گراں آج اعتبارِ کرم

ہر اعتبارِ انا تم کو زیب دیتا ہے
زباں سے اپنی کہو مرکزِ خیال ہیں ہم



دل نشیں کیوں نہ ہو مری آواز
کب سے ٹوٹا ہوا ہے دل کا ساز

قہقہوں نے بدل دیا انداز
کیا مرے غم کا ہو گیا آغاز

طائرِ فکر اور خلوتِ ناز
جل نہ جائے کہیں پرِ پرواز

دل دھڑکتا ہے لب کشائی سے
کوئی سن لے گا آپ کی آواز

بجھ گئے کتنے آنسوؤں کے چراغ
کتنے دل ہو گئے ہیں بے آواز

ڈس رہا ہے ہجومِ تنہائی
اے غمِ دوست تیری عمر دراز

چلنے والو ذرا ٹھہر جاؤ
کوئی دیتا ہے دور سے آواز

آ ترے گیسوؤں کو سلجھاؤں
کیف پرور ہے شامِ ناز و نیاز

کس سے طے ہو سکے خیال کبھی
جادۂ شوق کے نشیب و فراز





اے کاش امتیازِ مَن و تُو مٹا سکوں
سارے جہاں کو ایک ہی مرکز پہ لا سکوں

میرا چمن ہے اور مری شاخِ گُل مگر
مجھ کو یہ حق نہیں کہ نشیمن بنا سکوں

فرصت ملے تو غور کروں اپنے حال پر
تم کو بھی داستانِ تباہی سُنا سکوں

مجبوریاں نہیں یہ مقدّر کی بات ہے
تجھ کو بُلا سکوں نہ ترے پاس آ سکوں

پڑ جائے ایک بار جو چہرے پہ آپ کے
میری مجال کیا جو نظر کو ہٹا سکوں

اتنی تو دیجیے مجھے آزادیٔ زباں
دل میں جو بات ہے وہ زباں پر بھی لا سکوں

یہ آرزو ہے جذبۂ مہر و وفا سے میں
دشمن کو دوست، غیر کو اپنا بنا سکوں

شاید میں بھول جاؤں کسی دن خیال کو
ممکن نہیں کہ آپ کو دل سے بھلا سکوں



ایک شعر

بس ایک بار گلستاں کو دیکھ لینے دو
پھر اس کے بعد نشیمن مرا جلا دینا



گیسوؤں کی مہک، عارضوں کی چمک، جیسے ساون پہ حملہ کریں بجلیاں
سرخیٔ لب نکھرتی ہوئی کہکشاں، مسکراہٹ تری گلستاں گلستاں

نکہتِ زلف پھیلی ہوئی راہ میں، ہر قدم پر ہے اک شمعِ نقشِ قدم
دوستو جھومتے سوئے منزل چلو، جگمگانے لگے منزلوں کے نشاں

سایۂ گلبدن جب چمن پر پڑا، دفعتاً برق کے ہوش اڑنے لگے
شاخِ گل روشنی میں نہانے لگی، اپنے ہی نور سے جل گیا گلستاں

لے کے قندیلِ غم آ گئے تشنہ لب، کب کھلے گا نہ جانے درِ میکدہ
اس قدر دیر کیوں مئے کی تقسیم میں، سر بہ زانو ہے کیوں آج پیرِ مغاں

تم تو کھلتا ہوا پھول ہو حسن کا، میرے اجڑے نگر میں کہاں آ گئے
میں جزیرہ ہوں خوابوں کا جلتا ہوا، میرے خوابوں کی تعبیر کیا ہو بیاں

سو بہاریں نچھاور کرو دوستو، سو گلستاں سے رنگیں تخیّل مرا
گلستاں ساز میرا خیالِ سخن، نکہتِ گل ہے میری غزل کا جہاں



صبرِ پیہم سے کہیں آرزو بر آتی ہے
راہِ اُلفت میں مگر دل بڑا جذباتی ہے

اے شمیمِ نفسِ دوست سہارا دینا
زندگی تلخیٔ ایّام سے گھبراتی ہے

موجِ گُل بھُول کے ویرانے میں آئے جیسے
یوں کبھی آخرِ شب آپ کی یاد آتی ہے

عہدِ رفتہ کی ہر اک یاد کو دُھراتی ہوئی
ایک تصویر تصوّر میں اُبھر جاتی ہے

ورقِ دل کی طرح سادہ ہے احساسِ وفا
تیرے لہجے سے ہمیں بُوئے جفا آتی ہے

ان کا ہر وعدۂ فردا پسِ پردہ ہے خیال
ان کے ہر وعدۂ فردا پہ ہنسی آتی ہے



دوستو شہر میں کندن سے گراں ہیں کچھ لوگ
غم نصیبوں میں بھی نغموں کی زباں ہیں کچھ لوگ

آپ ہنستے ہوئے چہروں پہ نظر رکھتے ہیں
غور سے دیکھیے خاموش فغاں ہیں کچھ لوگ

خوگرِ ضبط زمانے پہ کھلیں گے کیونکر
پاس رہ کر ترے، تجھ سے بھی نہاں ہیں کچھ لوگ

دردِ اخلاص کی عظمت کو بڑھا دیتا ہے
واقفِ لذّتِ آدابِ فغاں ہیں کچھ لوگ

رُت بدل جائے تو ماحول بدل جاتا ہے
کیا کریں آج بھی مانوسِ فغاں ہیں کچھ لوگ

آبلہ پائی کا آجائے گا منزل پہ خیال
غم کے ماروں کے لئے سنگِ گراں ہیں کچھ لوگ



ستم کو مہربانی بے نیازی کو ادا سمجھے
ہماری سادگی دیکھو کہ ہم سمجھے تو کیا سمجھے

نگاہِ دوست کو ہم زندگی کا آسرا سمجھے
جہاں محفل سجی اپنی اُسی کو میکدہ سمجھے

سُنا ہے ہم نے وہ تو راہزن سے روز ملتے ہیں
جنھیں ہم کاروانِ زندگی کا رہنما سمجھے

کہاں کی گمرہی ہر مرحلے سے اور آ گے ہیں
جو تیرے نقشِ پا کو منزلوں کا راستہ سمجھے

جنھیں اپنا سمجھ کر اپنا دل بھی دیدیا میں نے
مری بد بختیاں دیکھو مجھے وہ بے وفا سمجھے

تبسّم جب کبھی آیا ہے ہونٹوں پر خیال اپنے
خرد والے تو بس اس کو جنوں کا آسرا سمجھے



رہِ وفا میں یہ مانا کہ پیچ و خم ہوں گے
مگر خیال سے ثابت قدم بھی کم ہوں گے

جب امتحان لیا جائے گا محبت کا
تمہارے چاہنے والوں میں صرف ہم ہوں گے

ہمارے حُسنِ تبسّم کو دیکھنے والو
ہماری رُوح کی گہرائیوں میں غم ہوں گے

حیا سے سُرخ ہوا پھول پھول چہرے کا
سُنا ہے وہ بھی بہاروں کے ہم قدم ہوں گے

تصوّرات کے پردوں کو اُٹھ تو جانے دو
تمہاری چشمِ کرم کے ہنر بھی کم ہوں گے

تبسّموں کا بھروسہ نہ کیجیئے گا خیالؔ
قدم قدم پہ محبت میں غم ہی غم ہوں گے



شعلۂ عارضِ گلفام سے جل جاتے ہیں
اہلِ دل آتشِ انجام سے جل جاتے ہیں

کیا خبر تجھ کو ترے واسطے اے شمعِ حیات
کتنے پروانے ترے نام سے جل جاتے ہیں

جن کے ویران دلوں میں نہیں آثارِ جنوں
وہ بہاروں کے بھی پیغام سے جل جاتے ہیں

ایسے دیوانے بہت ہم میں سے مل جائیں گے
آتشِ غم میں جو گمنام سے جل جاتے ہیں

آپ کی بزم کو چھو بھی نہیں سکتی ظلمت
روشنی کے لئے ہم شام سے جل جاتے ہیں

صبحِ روشن ہے ترے حُسنِ مجسّم کا خیال
چاند تارے بھی ترے نام سے جل جاتے ہیں



فصلِ گُل آئے گی پھر جشنِ بہاراں ہو گا
آپ آئیں تو مرے گھر میں چراغاں ہو گا

رہتی ہے میری نظر چہرۂ مستقبل پر
ہو گا وہ اور جو ماضی پہ پشیماں ہو گا

جس کو نسبت نہ رہی ہو گی ترے دامن سے
ہاں وہ فرزانہ اسیرِ غمِ دوراں ہو گا

تیرا آنا ہے بہاروں کی حقیقی آمد
تیرے جانے سے گلستاں بھی بیاباں ہو گا

زندگی جس کی کٹی ہے غمِ دوراں میں خیالؔ
وہ کہاں گردشِ دوراں سے پریشاں ہو گا



دستور ہے انوکھا دُنیائے عاشقی کا
ہوتا ہے دل کسی کا چلتا ہے بس کسی کا

پُرساں نہیں ہے کوئی دُنیا میں اب کسی کا
احساس مٹ گیا ہے بالکل ہی آدمی کا

ہوتا جو خود پہ حاصل کچھ اختیار ہم کو
لیتے نہ بھُول کر بھی پھر نام ہم کسی کا

خوش ہو رہے ہیں جس کو ہم روشنی سمجھ کر
"وہ روشنی نہیں ہے دھوکا ہے روشنی کا"

چاہا تھا بھُول جاؤں میں بیخودی میں سب کچھ
لیکن خیال ہر دم آتا رہا کسی کا



پیار کم یاب ہے، بے لوث محبت ہے گراں
ہاں ترے شہر میں اک جنسِ ہوس ہے ارزاں

غرقِ ساغر نہ کرو، نغموں کو کچھ دن کے لئے
نرخِ غم اور بھی ہو جائے گی اے دوست گراں

چشمِ نم رکھنا ذرا لفظِ محبت کا بھرم
اُن کا دامن بھی نہ بن جائے محبت کی زباں

اُن سے کہئے کہ وہ زخموں سے بہت دُور رہیں
جن کو منظور نہیں ساتھ رہیں چارہ گراں

دشتِ دل چھوڑ کر آجائیے گلشن میں خیال!
آج کانٹوں میں نظر آتی ہے پھولوں کی زباں



کسے سُناتے ہو دار و رسن کے افسانے
تمام عمر رہے سرفراز دیوانے

نہ جانے کب تری دُنیا میں پھر گذر ہو گا
میں پھر رہا ہوں تری یاد تجھ کو لوٹانے

بجھا رہی ہے سحر انتظار کی شمعیں
اُلجھ رہے ہیں ابھی آپ زلف سُلجھانے

ہمارا ذکر بھی مل جائے گا کہیں نہ کہیں
پڑھے گا جب بھی کوئی روشنی کے افسانے

تمام عمر کٹی گیسوؤں کو سُلجھانے
طُلوعِ صبح سے بڑھ کر ہیں شب کے افسانے

مسرتوں سے بہت دُور ہے خیالِ حزیں
نگار خانۂ غم میں ہے کیا خدا جانے



چُرانا چاہتا ہوں کچھ نشہ میں مست آنکھوں سے
اگر ساقی اجازت دے تو میں پی لوں نگاہوں سے

کسی کی چشمِ نم ہی یا دوست تھوڑی بھی کشش ہوتی
یقیناً لوٹ آتے ہم بھی اپنی رہگذاروں سے

خود آکر دیکھ لیں اہلِ حرم تہذیبِ میخانہ
یہ وہ محفل ہے جو خالی نہ ہو گی میگساروں سے

چھلکتے لب کی جو وابستگی پر ناز کرتے تھے
وہی خائف نظر آئے شبِ غم کے تقاضوں سے

قریبِ آشیاں یہ کس کے نقشِ پا چمکتے ہیں
نشیمن ہی نہ جل جائے کہیں گلنار قدموں سے

خیال اک برق لہرائی قفس کے تیرہ گوشوں میں
صدائے نغمۂ گُل جب بھی آئی آشیانوں سے



پلکوں کو سجا دیتا ہے اِنکارِ تمنّا
نیندوں کو اُڑا دیتا ہے اقرارِ تمنّا

پہلوئے محبّت ہے کہ گُلزارِ تمنّا
ہر ایک گُلِ زخم ہے شہکارِ تمنّا

تم اور ذرا پیچ و خمِ زُلف بڑھا دو
آزاد نہ ہو جائے گرفتارِ تمنّا

ظلمات کے سینے میں اُجالے اُتر آئے
کیا صُبح پرستوں کی ہے رفتارِ تمنّا

توفیقِ تکلّم تو عطا کیجیے ہم کو
کس طرح کریں جراٗتِ اظہارِ تمنّا

ہر شخص گرفتارِ محبت ہے خیال آج
باقی نہ رہا اب کوئی معیارِ تمنّا



خیرِ مقدم کے لئے راہ میں غم رُکتے ہیں
وقت رُکتا ہے، جہاں بھول کے ہم رُکتے ہیں

اہلِ دل، اہلِ نظر اہلِ ستم رُکتے ہیں
تیری راہوں میں ہزاروں کے قدم رُکتے ہیں

غالباً آج بھی روشن ہے کسی گھر میں چراغ
آج پھر شہرِ نگاراں میں قدم رُکتے ہیں

لے کے قندیلِ کرم کوئی بھی آگے نہ بڑھا
یہ وہ منزل ہے جہاں صاحبِ غم رُکتے ہیں

موجِ گُل کے لئے ہر سانس تری اذنِ خرام
میری وحشت سے بہاروں کے قدم رُکتے ہیں

تیرگی جتنی بڑھے اتنا اُجالا ہو گا!
آخرِ شب ہے اندھیروں کے قدم رُکتے ہیں

مل گیا تیرے تبسم کا سہارا جب سے
چشمِ پُرنم کے لئے درد و الم رُکتے ہیں

جب کبھی وادیٔ وحشت میں ٹھہرتا ہے خیال
بھولی بسری ہوئی یادوں کے صنم رُکتے ہیں



(ایک شعر)

جرأتِ عرضِ تمنّا کی اجازت بھی نہیں
آپ کے غم کی حکومت بھی عجب ہوتی ہے



تیرا مزاج حُسن ہے، مفہوم جام ہے
میرا خیال گردشِ دوراں کا نام ہے

مدّت کے بعد شہر میں آیا تو ہوں مگر
راس آئے کہ نہ آئے جُنوں تیز گام ہے

مجھ کو یہ ڈر ہے پیار کی خوشبو بکھر نہ جائے
گُل ہائے داغِ دل کا بڑا اہتمام ہے

جشنِ چراغاں کیسے منائیں گے دوستو
آثارِ صُبح میں ابھی تحریکِ شام ہے

تم ہی کہو کہ پیاسی نگاہوں سے کیا کہوں
تم سامنے ہو پھر بھی نظر تشنہ گام ہے

دیدہ وروں کی نظریں جھکی ہیں ابھی تلک
ساقی تری نگاہ کا کیا اہتمام ہے

یارو سلوکِ فصلِ بہاراں بجا مگر
جورِ خزاں بھی موسمِ گُل کا پیام ہے

اک جنبشِ نگاہ بھی سب کچھ تو ہے مگر
محتاط کس قدر ترا طرزِ کلام ہے

رندانِ میکدہ ہو کہ آوارگانِ شہر
تیرے خیال کا سرِ فہرست نام ہے





عنبری زُلف کو لہراؤ کہ کچھ رات کٹے
میری باہوں میں سما جاؤ کہ کچھ رات کٹے

رہزنِ شب سے نہ گھبراؤ چلو چلتے رہو
آبلے پاؤں کے چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے

ذہن و دل میں نہ اُتر جائیں اندھیرے یہ کہیں
تم مرے پاس چلے آؤ کہ کچھ رات کٹے

رات تاریک سہی صبح کی اُمید ہو تم
اور کچھ دیر ٹھہر جاؤ کہ کچھ رات کٹے

چاندنی رات کو ڈس لے نہ کہیں تنہائی
ایسے لمحات میں آجاؤ کہ کچھ رات کٹے

کب سے چپ چاپ کھڑی ہے درِ زنداں پہ بہار
اب مری کوئی غزل گاؤ کہ کچھ رات کٹے

صُبح کی روشنی ہر گھر میں بکھر جائے خیال
اب خیالات میں کھو جاؤ کہ کچھ رات کٹے



دمِ آخر نہ تڑپاؤ ابھی کچھ رات باقی ہے
مرے نزدیک آجاؤ ابھی کچھ رات باقی ہے

کہاں ہو پھر نگارِ صبح سے لمبی ملاقاتیں
ابھی کچھ دیر رُک جاؤ ابھی کچھ رات باقی ہے

جُدا کر دے گی ہم کو، کوئی دم میں صبح کی دستک
گھنی زُلفوں کو لہراؤ ابھی کچھ رات باقی ہے

میں شاعر ہوں اُجالوں کے لئے میں روز جیتا ہوں
نگاہوں میں سما جاؤ ابھی کچھ رات باقی ہے

بساطِ قلب کا ہر زخم اک سُورج نظر آئے
اُجالا ساز بن جاؤ ابھی کچھ رات باقی ہے

چمن میں پھول شرمائیں ستارے ماند پڑ جائیں
بزعمِ حُسن آجاؤ ابھی کچھ رات باقی ہے

بھٹکنے کے لئے تو اور بھی کچھ عُمر باقی ہے
خیال اب لوٹ کر آؤ ابھی کچھ رات باقی ہے



چراغ دل کے جلا کر بھی ہم کو کچھ نہ ملا
تمہاری بزم سجا کر بھی ہم کو کچھ نہ ملا

تری نظر کی فسوں کاریوں کو بھی اے دوست
کرشمہ ساز بنا کر بھی ہم کو کچھ نہ ملا

لبِ حیات پہ جو آہ تھی سو آج بھی ہے
فغاں کو نغمہ بنا کر بھی ہم کو کچھ نہ ملا

اندھیرے شہر کی ہر موڑ پر ہیں پھیلے ہوئے
نظر کو جلوہ بنا کر بھی ہم کو کچھ نہ ملا

تمہاری بزم کا دستور ہی نرالا ہے
دل و نگاہ لٹا کر بھی ہم کو کچھ نہ ملا

خیالِ دور کی شہنائیاں ہی اچھی تھیں
انھیں قریب بلا کر بھی ہم کو کچھ نہ ملا



وہ ٹھکرا کے دیر و حرم آ گئے ہیں
ترے ساتھ جو دو قدم آ گئے ہیں

میں کیسے سنواروں گا زلفوں کو تیری
مقدر میں جب پیچ و خم آ گئے ہیں

قدم دو قدم کیا چلا ساتھ تیرے
مرے ساتھ دیر و حرم آ گئے ہیں

ترے ساتھ آئیں دو عالم کی خوشیاں
مرے ساتھ دنیا کے غم آ گئے ہیں

سلامت رہیں تیری زلفوں کے سائے
زمانے سے گھبرا کے ہم آ گئے ہیں

نئی صبح کا رنگِ رخ کیوں نہ نکھرے
سرِ منزلِ دار ہم آ گئے ہیں

خیال آپ کا ہم سے دامن کشاں تھا
خیال آشنا بن کے ہم آ گئے ہیں



فغاں کو نغمہ بنا لوں تو تم چلے جانا
غزل میں اپنی سُنا لوں تو تم چلے جانا

دمِ وداع ذرا بے قرار آنکھوں کو
میں آنسوؤں سے سجا لوں تو تم چلے جانا

کسی کے نقشِ قدم پر جھکا ہے سر اپنا
جبینِ شوق اُٹھا لوں تو تم چلے جانا

تمہارے عارض و لب کی شعاعیں تیز سہی
نظر کو رُخ سے ہٹا لوں تو تم چلے جانا

دُعائے صبح سُنا ہے قبول ہوتی ہے
میں جشنِ صُبح منا لوں تو تم چلے جانا

خیال تم سے بہت کچھ ابھی تو کہنا ہے
میں اپنے دل کو منا لوں تو تم چلے جانا



مری حیات کو صرف آپ کا سہارا ہے
بغیر آپ کے جینا کیسے گوارا ہے

تمہارا درد مجھے جان سے بھی پیارا ہے
تمہارے نام سے جو غم ملے گوارا ہے

نئی بہار، نیا گلستاں، نیا گلچیں
انہی کے وار نے گلشن میں مجھ کو مارا ہے

فرازِ عرش سے ٹکرا گئی مری آواز
خلوصِ دل سے تمہیں میں نے جب پکارا ہے

تمہاری یاد نے جینا سکھا دیا مجھ کو
تمہارے غم نے مرا حوصلہ بڑھایا ہے

شریکِ جام رہے آپ کا خیال اگر
مئے حیات کی تلخی مجھے گوارا ہے



دیارِ دلبراں تک آ گئے ہیں
زمیں سے آسماں تک آ گئے ہیں

تصوّر ہی تصوّر کے سہارے
تمہارے آستاں تک آ گئے ہیں

خدا رکھے سلامت عظمتِ غم
دیوانے گلستاں تک آ گئے ہیں

چلو پیتے چلیں دو گھونٹ زاہد
مقامِ میکشاں تک آ گئے ہیں

سنبھل کر سوچ کر چلنا کہ رہزن
غبارِ کارواں تک آ گئے ہیں

خدا حافظ ترا اے ضبطِ گریہ
کہ اب نالے زباں تک آ گئے ہیں

خیالِ دوست کو ہمراہ لے کر
ہجومِ دوستاں تک آ گئے ہیں



خِرد نے صرف بہاروں کا انتظام کیا
مرے جُنوں نے خزاں کا بھی اہتمام کیا

سلیقہ آ گیا غم میں بھی مُسکرانے کا
تمہارے غم کی نوازش نے خوب کام کیا

کہی نہ بات کبھی کوئی دل کے مطلب کی
کلام جب بھی کیا تم نے نا تمام کیا

کچھ اور حوصلے مضبوط ہو گئے دل کے
جلا کے برق نے خرمن عجیب کام کیا

کبھی تو ہم کو رہا شام سے سحر کا خیال
سحر سے ہم نے کبھی انتظارِ شام کیا



کیا یہ فیضِ گردشِ انجام ہے کیا بات ہے
اُن کے ہونٹوں پر ہمارا نام ہے کیا بات ہے

میری آنکھیں خشک ہیں اور اُن کا دامن تر بہ تر
زندگانی پھر بھی تشنہ کام ہے کیا بات ہے

جو تمہیں بھولے سے بھی مڑ کر نہیں دیکھا کبھی
دید کا اُس شخص پر الزام ہے کیا بات ہے

جس کے ہاتھوں میں رہا سورج کی کرنوں کا ایاغ
آج وہ میکش اسیرِ شام ہے کیا بات ہے

جو تمہاری انجمن میں رات بھر جلتا رہا
دامنِ شب میں اُسی کا نام ہے کیا بات ہے

ذہن میں تھا جس کے گلشن کو سجانے کا خیال
آج تک بھی وہ اسیرِ دام ہے کیا بات ہے



میں آنکھوں آنکھوں میں ان کا پیام لے لوں گا
نظر بچا کے نظر سے سلام لے لوں گا

مجھے یقین ہے اُجڑے ہوئے گلستاں میں
بہار آئے گی، جب تیرا نام لے لوں گا

خِرد تو خیر، سلیقہ شناس ہے اے دوست
میں لغزشوں سے سلیقے کا کام لے لوں گا

نہیں ہے کچھ مجھے ساغر کے ٹوٹنے کا ملال
تری نگاہ سے ساغر کا کام لے لوں گا

سُنا کے ان کو نگاہوں سے داستانِ فراق
زباں کا اپنی نگاہوں سے کام لے لوں گا

فقط خیال کی دُنیا گزارنے کے لئے
خیالِ یار سے میں اتنا کام لے لوں گا



واقفِ لذتِ آزار کیا خوب کیا
دامِ گیسو میں گرفتار کیا خوب کیا

کوششِ ضبط نے اشکوں کے دیئے سلگائے
ہم نے پانی کو شرر بار کیا خوب کیا

بات نکلی تو تکلف کا کہیں ذکر نہ تھا
کھل کے حالات کا اظہار کیا خوب کیا

ہم تو انجان مسافر تھے ترے شہر میں دوست
تو نے دانستہ گرفتار کیا خوب کیا

تیرے دیوانے بہاروں میں بھٹک جاتے تھے
آتشِ قرب کو گلزار کیا خوب کیا

یاد آئی تو چلا آیا ترے غم کا خیال
دلِ محزوں کو گرفتار کیا خوب کیا